فرخندہ لودھی
P7-DDB-427

جب بجا کٹورا

(افسانے)

فرخندہ لودھی

سانجھ

کتاب : جب بجا کوُرا
مصنف : فرخندہ لودھی
اشاعت : مئی 2009
تعداد : 500
مطبع : حاجی حنیف پرنٹرز
قیمت : 200

ISBN:978-969-8957-44-5

سانجھ
SANJH PUBLICATIONS

دوسری منزل، منتی بلڈنگ، 17/31 ٹیمپل روڈ، لاہور
فون:042-7355323 فیکس: 042-7323950
ای میل: sanjhpk@yahoo.com
sanjhpks@gmail.com

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :
https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

انتساب

ڈاکٹر انور سدید کے نام

ترتیب

مُقدّمہ

"مشین کی چمکتی گراری کے چمکدار پہیے میں اپنا لبوترا چہرہ دیکھنا
اُسے ہمیشہ حیران کُن اور اچھا لگتا تھا' جب کہ آئینے میں اُسے اپنی
صورت ویسی ہی نظر آتی تھی' جیسی کہ وہ تھی' کوئی بگاڑ یا بہتری نظر
نہیں آتی تھی۔"

یہ اقتباس اُردو کی ممتاز افسانہ نگار فرخندہ لودھی کے افسانے "مُنّی کیسے مرے" سے ہے۔ اِسے اُنھوں نے مُنّی کا کرداری خاکہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے مگر جیسا کہ ہر عمدہ فن پارے میں یہ عمل ہوتا ہے کہ لفظ' جملے' لکیریں' خاکے اپنے لغوی و فوری تناظر کو عبور کر جاتے اور ایک نئی صورتِ حال کی نمایندگی کرنے لگتے ہیں۔ یہ عمل اِس اقتباس میں بھی رُونما ہوا ہے۔ اس کا لغوی و فوری تناظر تو مُنّی کے کردار کے ٹیڑھے پن کا بیان ہے' مگر علامتی سطح پر یہ آرٹ (اور یہاں افسانے) کے تخلیقی عمل کا بیانیہ ہے اور بیانیہ بھی ایک نئے طرز کا۔ عمومی طور پر آرٹ کو آئنہ قرار دیا جاتا ہے' یعنی آرٹ زندگی کو ویسے ہی دکھاتا ہے' جیسے زندگی ہے۔ آرٹ کا یہ نظریہ نقل ہے مگر مندرجہ صدر اقتباس میں یہ مؤقف اختیار کیا گیا ہے کہ آرٹ زندگی کے چہرے کو "لبوترا" بنا کر پیش کرتا ہے۔ زندگی کے چہرے کو ویسا ہی پیش کرنے کے بجائے' اسے بدل کر' اس کی تقلیب کر کے پیش کرتا ہے۔ گویا زندگی کی ترجمانی کے برعکس' زندگی کو تخلیق کرتا ہے۔ اگر آرٹ کو زندگی کا آئنہ سمجھا جائے تو تخلیق کار یا تو منہا ہو جاتا ہے یا پھر وہ ایک غیر جانب دار اور لاتعلق میڈیم بن جاتا ہے مگر دوسری صورت میں تخلیق کار ایک ایسے وِژن کا حامل ہوتا ہے' جو باہر موجود زندگی کو بدل کے پیش کرتا ہے۔ تاہم واضح رہے کہ زندگی کو بدلی ہوئی صورت

میں پیش کرنا' اس بات کی ضمانت نہیں کہ آرٹ وجود میں آگیا ہے۔ آرٹ کی ضمانت حیرت اور مسرت میں ہے۔ جیسا کہ اوپر درج اقتباس میں وضاحت موجود ہے کہ "لمبوترا چہرہ منّی کو حیران کن اور اچھا لگتا تھا" منّی' تخلیق کار کی علامتی نمایندہ ہے۔

یہ مخصوص تخلیقی عمل فرخندہ لودھی کے بیش تر افسانوں میں موجود ہے۔ بہ الفاظ دیگر اُنھوں نے اپنے افسانوں میں زندگی کا "لمبوترا" چہرہ پیش کیا ہے۔ تاہم واضح رہے کہ 'لمبوترا' چہرا بگڑا ہوا یا بہتر نہیں ہوتا (جیسا مندرجہ صدر اقتباس میں درج ہے) وہ بس آرٹ کا تخلیق کردہ چہرہ ہوتا ہے۔ آرٹ کے ضابطے اور رسومیات اُسے مخصوص خدوخال اور شباہت دیتے ہیں۔ بگڑا یا بہتر ہونا باہر کی زندگی کی نسبت سے ہے۔

فرخندہ لودھی کے اس افسانوی مجموعے میں جس 'چہرے' کی رُونمائی ہوئی ہے' وہ ثقافتی ہے۔ آرٹ کی مذکورہ بالا تھیوری کو پیش نظر رکھیں تو کہہ سکتے ہیں کہ اُنھوں نے افسانوں میں ثقافتی زندگی کی ترجمانی نہیں کی' ایک (نیا) ثقافتی چہرہ مصوّر کیا ہے۔ محض اردگرد کی زندگی کا ثقافتی بیانیہ لکھنے کی بجائے' ایک مختلف اور نیا ثقافتی بیانیہ تخلیق کیا ہے۔ لہٰذا ان کے افسانوں میں ہماری ثقافت خود کی باز دید نہیں کرتی' اپنی "بازیافت" کرتی ہے۔ باز دید اور بازیافت میں جو فرق ہے' وہ محتاجِ وضاحت نہیں۔

ثقافت تین سطحیں رکھتی ہے: ارضی و اجتماعی سطح' نشانیات کی سطح اور بیک وقت دونوں۔ پہلی سطح پر زمینی و اجتماعی معاشرتی رشتوں کا محض بیان نہیں ہوتا' ان رشتوں کے ذریعے اُس معنویت کا انکشاف ہوتا ہے جو کسی سماجی گروہ کو تشخص دیتی ہے۔ دوسری سطح' کسی ثقافت کے علامتی نظام کی علم بردار ہوتی ہے۔ اسی نظام کی مدد سے ثقافت ایک مخصوص تصورِ کائنات ترتیب دیتی ہے۔ یہ طے کرنا خاصا مشکل ہوتا ہے کہ پہلی سطح دوسری کو جنم دیتی ہے یا دوسری' پہلی کو۔ تاہم یہ طے ہے کہ ایک مقام پر دونوں یکجا ہو جاتی ہیں۔ کسی ثقافت کا تصورِ کائنات جو اپنی قابلِ شناخت صورت میں تجرید ہوتا ہے' اس ثقافت کی ارضی و معاشرتی بنیاد میں پیوست دکھائی دیتا ہے۔ ثقافت کا یہ سہ طرفہ اظہار و عمل فرخندہ لودھی کے افسانوں میں موجود ہے۔

پہلی سطح کے اظہار و عمل کی مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

"وہ گرمیوں کی شام میں جب الماس کے کچے آنگن میں نوکر چھڑکاؤ کر کے مسہریاں لگا دیتے تو اسے بہت رشک آتا۔ وہ اپنی چھت کی دیوار کے جھروکوں سے دیکھتی اور دیکھتی چلی جاتی اور اس کا دماغ کچی مٹی کی خوشبو کو پہچانتا اور بدن میں اپنائیت کی جھرجھری سی پھر جاتی۔" (مُنّی کیسے مرے)

"یہ حقیقت ہے کہ ابرار کو اپنے کھیتوں' اپنے پشتوں اور کھیتوں کے کنارے اُگے ہوئے شیشم' جامنوں اور بیریوں سے بہت پیار تھا۔ ان میں سے بہت سے اس کے ساتھ ساتھ بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔ کتنے عزیز تھے یہ سب' کبھی خزاں کے زمانے میں ان کی چھانٹی کرنی پڑتی تو اسے دُکھ ہوتا------ یوں لگتا جیسے وہ چیخ چیخ کر کہتے ہوں۔ "یار----! ہاتھ ہلکا رکھ------ درد ہوتا ہے"

(چپڑی روٹی)

ثقافت کی ارضی سطح کے اظہار کا مطلب فقط ارضی مظاہر کا بیان یا محاکات نہیں ہے۔ جب کردار ارضی مظاہر سے خود کو پوری طرح جڑے ہوئے محسوس کرے' ان سے زندہ رشتہ قائم کرے اور یہ رشتہ معنویت کے ایک ایسے ہالے کو جنم دے جس میں کردار اور مظاہر' ہردو کا اثبات ہو' ہردو کو شناخت ملے' تو سمجھیے ثقافت نے اپنی ارضی نمود کی بازیافت کی ہے۔ چنانچہ جب کردار' ان مظاہر سے الگ ہونے پر مجبور ہوتے ہیں تو انھیں اپنا وجود ہی بے معنی محسوس ہونے لگتا ہے۔ "چپڑی روٹی" کا ابرار اسی تجربے سے گزرتا ہے۔

ثقافت کے ارضی و معاشرتی رشتوں کی فلاسفی یکساں ہے۔ یہ فلاسفی افسانہ "خاتونِ آخر" کے اس ٹکڑے میں عمدگی سے بیان ہوئی ہے۔

"ہم لوگ نہایت گندی ذہنیت کے مالک ہیں' بالکل غلامانہ۔ ہم لوگ جب ویت نامیوں کے لیے رو بلک رہے تھے تو ہمارے بنگالی بھائی ہم سے چھٹکارا پانے کی تجاویز سوچ رہے تھے۔ اب پی ایل او اور تیسری دُنیا کے دُکھ میں دن رات سلگتے ہیں۔ اپنے اندر روگ

پل رہے ہیں۔ ہم ایک بہاری عورت کی مدد نہیں کر سکتے جو ہماری
ذمے داری ہے۔ پسلیاں بیچنے کے ساتھ ہم نہیں سوچتے کہ وہ خود
کن داموں بکتی ہے۔ بے چاری خاتونِ آخر۔ خلیل ایسی گری پڑی
عورت کو خاتونِ آخر کہا کرتا ہے۔ خاتونِ اول جس کا بہت احترام
اور مقام ہو۔۔۔۔ خاتونِ آخر جس کا کچھ بھی اپنا نہ ہو۔"

یعنی جس طرح کردار اور ان کی وجودی شناخت' ارض سے وابستہ ہے' اسی طرح معاشرتی زندگی بھی کرداروں کو حیات اور شناخت دیتی ہے۔ کردار جب اپنی متعلقہ معاشرت سے علاحدہ ہوتے ہیں تو بے معنی اور بے شناخت ہو جاتے ہیں۔ فرخندہ لودھی بے معنی اور بے شناخت ہونے کو طرز آگندی اور غلامانہ ذہنیت سے موسوم کرتی ہیں۔ یہ ذہنیت ایک معاشرتی زندگی سے علاحدگی اور دوسری معاشرتی زندگی سے "وابستگی" کا نتیجہ ہوتی ہے۔ پہلی سے رشتہ حقیقی ہوتا' جب کہ دوسری سے وابستگی تشکیلی ہوتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ عقیدتی یا آئیڈیالوجیکل رشتہ بہ ظاہر کردار کو ایک نئی شناخت دیتا ہے۔ کردار بنگال کے بجائے ویت نام اور فلسطین کے مصائب پر دُکھی ہوتا ہے۔۔۔۔ مگر یہ نئی شناخت غیر حقیقی ہوتی ہے کہ کردار کے پاس نہ حقیقی جذبات ہوتے ہیں' نہ اس سوال کا جواب ہوتا ہے کہ اپنی ارضی معاشرتی زندگی کے تعلق میں بے حِسی اختیار کر کے ایک دُور دراز کی زندگی کے المیوں پر حقیقی معنوں میں کیوں کر پریشان ہوا جا سکتا ہے؟ تاہم فرخندہ لودھی کے پاس اس سوال کا جواب موجود ہے۔ یہ کہ یہ آئیڈیالوجی کی پیدا کردہ غلامانہ ذہنیت کے سوا کچھ اور نہیں۔

ثقافت کی نشانیاتی سطح' فرخندہ لودھی کے یہاں ایک خاص ڈھب سے ظاہر ہوئی ہے۔ انھوں نے نشانیاتی سطح کو متصوفانہ عناصر کی صورت مشخص کیا ہے۔ یہ عناصر بعض جگہ متن اور کہیں مخفی ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ ہماری ثقافت کے علامتی نظام کو تصوف سے عبارت قرار دیتی ہیں۔ اُن کی نظر میں ہماری ثقافت نے جو تصورِ کائنات تشکیل دیا ہے' وہ اپنی اصل میں متصوفانہ ہے۔ ظاہر ہے وہ یہاں ہماری ثقافت کے ایک مخصوص دورانیے کو پیش نظر رکھے ہوئے ہیں۔ جب متصوفانہ تصورِ کائنات سرایت گیر

انداز میں کارگر تھا۔ اب اس تصور کائنات میں سائنسی عناصر شامل ہو گئے ہیں اور چیزیں کافی گڈمڈ ہو گئی ہیں۔ فرخندہ لودھی ہماری موجودہ ثقافت کے علامتی نظام میں مضمر پے چیدگیوں اور تضادات کی طرف متوجہ نہیں ہیں' تاہم اُنھوں نے اس نظام کے متصوفانہ عناصر کو کارگر حالت میں پیش کیا اور یہ باور کرانا چاہا کہ یہ عناصر اب بھی کارگر ہیں گویا یہ عناصر آفاقی اور مطلق حیثیت رکھتے ہیں۔ عناصر کا آفاقی و مطلق ہونا بہ ہر حال التباس ہے۔

"مُنّی کیسے مرے" کا آخری ٹکڑا ان معروضات کی قطعی دلیل کے طور پر پیش ہے۔

"ننھے مزار کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے دیکھتے گویا اس کے اندر سے کئی سوالات کے جواب آپ ہی آپ اُبھر رہے تھے۔ اس کی روح و قلب کی وساطت سے وہ بے ہوشی اور نیم ہوش مندی کے درمیان ادب اور احترام کے رستے پر کسی مداری کے معمول کی طرح سفر کر رہی تھی۔ وجود معلق اور سفر دشوار۔ موت کی وادی سے واپسی کا سفر کٹھن اور سانس سانس بھر دو بھر----- مگر کتنا اٹل-----!

کہ ابھی بہت سے سوال باقی تھے۔ بہت سے سوال اٹھنے کو تڑپ رہے تھے۔ عجب نشہ تھا کہ چھٹکارا بس میں نہ تھا۔

"مکوڑے شاہ کے تعویذ میں جلتے چومکھیے دیے کو تکتے تکتے اس نے خود کو باور کرانے کی کوشش کی۔

"سب کچھ میرے اندر ہے----- سب کچھ میری نظر میں ہے----- میں ہوں' میں ہوں-----"

"مُنّی بڑبڑا رہی تھی----- اور زندہ تھی۔"

مُنّی اپنے گھر میں معتوب کردار ہے کہ وہ زندگی کرنے کا باغیانہ ڈھرا اختیار کرتی ہے۔ اس کے اندر اردگرد کی منافقانہ اور تکرار آلود زندگی کے تعلق میں سوالات کلبلاتے ہیں۔ ان سب کا جواب اُسے اپنے مذکورہ بالا تجربے میں ملتا ہے۔ یوں لگتا ہے مزار کی فضا اس کے اندر صدیوں سے (ایک علامتی نظام کی صورت) موجود ہے۔ اُسے اپنا اثبات اسی

فضا میں تحلیل ہونے سے ملتا ہے۔

ثقافت کی نشانیاتی اور ارضی سطح کی یک جائی کی دل فریب مثال ان کا افسانہ "شاد کام" ہے۔ اس افسانے میں سرس کے درخت کو کیبری کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ درخت ہی یک جائی کی مثال ہے۔ اس کردار سے وہ تمام اوصاف وابستہ ہیں جو راہِ سلوک کے ایک مسافر کے لازمی اوصاف ہیں۔ عشق' عشق میں استحکام' قربانی اور قربانی کے بعد زندگی کی ارفع معنویت کا نایاب تجربہ۔ قربانی ہر چند وجود کا خاتمہ کرتی ہے' مگر یہ خاتمہ ایک نئے جنم کا سرِ آغاز ہوتا ہے کہ وجود (متصوفانہ علامتی نظام کی رُو سے) انفرادی نہیں' کُلی حقیقت ہے' اس لیے عشق و قربانی وجود کی ایک سطح اور ایک منزل کا خاتمہ کرتی ہے۔ یہ خاتمہ اس لحاظ سے ضروری ہوتا ہے کہ وجود کی ایک منزل کو عبور کیے بغیر اگلی منازل تک رسائی محال ہوتی ہے۔ صوفی انفرادی وجود کی "قربانی" دے کر ہی کُلی حقیقت کا حصہ بنتا ہے' اس کے لیے یہ عمل اور تجربہ شاد کامی کا ہوتا ہے۔

> "..... میں شاد کام ہوں' جیسی میں نے تمنا کی تھی۔ میں نے چاہا تھا اور چاہتا رہا ہوں کہ میں اس کے کسی کام آ سکوں۔۔۔۔۔
> طارق کے چہرے پر ایک طمانیت ہے۔ اُس کے ارادوں سے بجی ہوئی دل کشی میں اپنی بجھتی ہوئی آنکھوں سے بھی دیکھ سکتا ہوں۔
> میں شاد کام ہوں کہ اُس نے مجھے زندگی کے دھارے میں شامل کر لیا۔ بلاشبہ میں شامل ہوں' اس کے ارادے میں' کام میں۔۔۔۔۔" (شاد کام)

کم و بیش یہی تھیم "جب بجا کٹورا" میں ایک دوسرے اسلوب میں پیش ہوا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار 'میاں جی' اپنے وجود کی سطحوں کو 'تج' دینے کے تجربے سے گزرتا ہے۔ چوں کہ اس تجربے کو ایک زیریں لہر کے طور پر افسانے کے 'بیانیاتی ڈسکورس' میں پیش کیا گیا ہے' اس لیے سرسری قرات میں اس تجربے تک رسائی نہیں ہوتی' تاہم جب قاری کی گہری نظر بیانیاتی ڈسکورس کی تہیں کھنگالتی ہے تو یہ تجربہ نو دیتا اور افسانے کا باطن جگمگاتا محسوس ہوتا ہے۔ میاں جی پیدائشی کبڑے تھے اور اس سبب سے وہ خدا کے متعلق

یہ تصور قائم کرنے کے قابل ہوئے کہ "جب سانس اپنے آپ آتی جاتی رہتی ہے تو خدا بھی اپنے آپ انسان کے بیچ بسا رہتا ہے۔ میاں جی اگر پیدائشی کبڑے نہ ہوتے تو شاید اتنی سادگی اور سہولت کے ساتھ خدا کے تصور کو باور نہ کرتے۔" یعنی وہ خدا تک اپنی خلقی معذوری کے 'ذریعے' پہنچے۔ یہ یقین اس ثقافتی نشانیات کے تحت ہے جو ہر منظر اور واقعے کو خدا کی منشا و مرضی کا نتیجہ قرار دیتی ہے اور خدا کی مرضی کو خالی از حکمت نہیں ٹھہراتی۔ یہی نشانیات (اور مذہبی اصطلاح میں عقیدہ) اس کی روح کی راہ نما قوت بن جاتی ہے۔ چناں چہ "اُنھوں نے ظاہری حُسن کو جرص و ہوا جانا' سراب سمجھا۔ قدرت نے انھیں ایک مُڑا تڑا جسم دے کر انھیں ہستی کے فریب سے نکال دیا تھا" مگر ہستی کا فریب تین مواقع پر ان کے راستے میں حائل ہوا اور تینوں دفعہ وہ اسے عبور کرنے میں کامیاب ہوئے۔ پہلی بار جب گڈو کنورا بجاتی ان کے سامنے آئی' دوسری مرتبہ جب ان کی بلقیس خالہ نے انھیں اپنی بیٹی سے بیاہنے کا وعدہ ایفا کرنا چاہا اور تیسری مرتبہ جب اختر اپنی پھوپھی سے ان کے نکاح کی پیش کش لے کر ان کے پاس آیا۔ ہستی کے فریب کا آخری وار ان کی زندگی کی سب سے بڑی آزمائش ثابت ہوا۔ وہ اس آزمائش میں بھی پورے اُترے' مگر اس کامیابی کے لیے انھیں جاں سے گزرنا پڑا---- افسانے کے اختتام پر پہنچ کر قاری کو جھٹکا لگتا ہے۔ ایک 'کبڑے مولوی' کو جب شرعی طریقے سے حوا کا وصال نصیب ہو رہا ہے تو وہ کش مکش میں کیوں مبتلا ہوا اور تیسرے دن جاں سے گزر گیا۔ میاں جی کا اچانک انتقال افسانے کا Proaretic Code ہے۔ کیا وہ خوشی سے مرگیا یا کسی دوسری وجہ سے؟ افسانے کے پورے بیانیاتی ڈسکورس کو لحاظ میں رکھیں تو میاں جی کی مرگِ ناگہانی کی وجہ خوشی نہیں' کوئی دوسری وجہ ہے اور یہ وجہ دراصل ہستی کے فریب سے بچنا ہے۔ میاں جی نے جب اپنے مڑے تڑے بدن کی حقیقت کو قبول کرتے ہوئے' خدا سے لو لگائی تھی تو یہ عمل دراصل مڑے تڑے بدن کو تج دینے کا عمل تھا۔ چوں کہ یہ عمل میاں جی نے اپنی روح کی گہرائی کے ساتھ انجام دیا تھا' اس لیے جب اختر کی پھوپھی کے بدن نے اس کا تعاقب کیا تو میاں جی کی ثقافتی نشانیاتی دنیا میں اس کا واحد حل بدن کو ہی عبور کر جانا تھا۔

فرخندہ لودھی کے تقریباً تمام افسانوں میں ثقافتی نشانیات پر تشکیک کا اظہار ملتا ہے نہ اسے ترک کرنے کا رویہ! ان کے افسانوی کردار' بالعموم ہم آہنگی اور وابستگی کو انحراف اور علاحدگی پر ترجیح دیتے ہیں۔ تاہم یہ ہم آہنگی نہ سطحی ہے' نہ مصنوعی ہے۔ ان کا افسانہ اپنی مستحکم ثقافتی نشانیات کی گہری تہوں کو دریافت کرنے اور ان سے وابستہ ہونے کا 'تحقیقی علامتی بیانیہ' ہے اور غالباً یہی بات انھیں اپنے معاصرین میں ممتاز حیثیت دیتی ہے۔

آخر میں فرخندہ لودھی کے افسانوں سے چند ایسے جملے جنھیں ہماری ثقافتی نشانیات کے جو ہر پارے قرار دیا جا سکتا ہے' مگر جنھیں ایک تخلیقی ذہن ہی تشکیل دے سکتا ہے۔ انھیں افورسم بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ کسی ادیب کی تخلیقی رفعت کو پہچاننے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دیکھا جائے کہ اُس کے یہاں افورسم کی تعداد کتنی ہے اور ان میں علامتی معانی کا عالم کیا ہے!

"حیا اور حِس میرا خیال ہے ایک ہی رد عمل کا نام ہے۔"

"ستاروں پر ہر شخص کمند نہیں ڈال سکتا' فقط دیکھ کر آنکھیں خیرہ کر سکتا ہے۔"

"دو قسم کے لوگوں کے لیے جی جانا مقدر ہے بیٹے۔ ایک وہ جو اپنے دور سے پیچھے رہیں۔ دوسرے وہ جو آگے بڑھ کر سوچتے ہوں۔"

"مجھے ہر مرد' خدا نظر آتا ہے۔ قہار' جبار اور جب میں اس کے قرب میں ہوتی ہوں تو وہ غفار ہوتا ہے' جیسے سارے گناہ میرے ہیں اور وہ ستار العیوب ہے۔"

"خدا کو حیات سے الگ تو نہیں کیا جا سکتا۔"

"اس دُنیا میں ہر بات معنی رکھتی ہے اور سمجھ میں آنے کی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر بات ہر وقت قابلِ توجہ نہیں ہوتی۔"

(ڈاکٹر) ناصر عباس نیّر
شعبہ اُردو
پنجاب یونی ورسٹی' لاہور
16 ستمبر 2008ء

اپنی بات

کوئی اگر مجھ سے پوچھے کہ کہانی کیا ہے؟ تو میں چپ رہوں گی۔
کوئی کہے کہ کیا کہانی کوئی قضیہ ہے؟ تو میں کہوں گی' ہاں' قضیہ ہے' زندگی کے گلے میں پڑا ہُوا اور میرے لیے سکیچ ہے جس میں مجھے رنگ بھرنا ہیں۔ مناسب طریقے سے' مناسب جگہوں پر' کتنے نچوڑ دینے ہیں کہ وہ پہلو نمایاں اور دلپذیر ہو جائیں' تصویر پر نظر پڑتے ہی توجہ کھینچ لے۔
کہانی وجدان ہے۔ میں اس کو دریافت کرنا' جاننا' پہچاننا چاہتی ہُوں۔ اُس کے سنگ زندگی گزارنا چاہتی ہُوں' مکمل مل جانا چاہتی ہُوں۔
کہانی کوئی دُلھن ہے جسے لوگوں کے سامنے بن سنور کر جانا چاہیے اور پھر شبِ عروسی کا معاملہ بھی ہے اُسے۔ ہاں ایسا تو اُس کے ساتھ ہے۔ پیا من بھانے کا مسئلہ ویسے ہی جانکاہ ہوتا ہے۔
کہانی شاعری ہے۔ غزل وائی اور غزل کے پہلو بہ پہلو چلتی ہوئی نظم کے لبادے میں لپٹی' کہیں گیت ہے' کہیں نوحہ اور کہیں آہنگ یا کسی اپسرا کا انگ۔ اسے چت چور حسینہ کہیں تو بھی مضائقہ نہیں۔ چنچل الھڑ مٹیار کا روپ دھار لے تو یہ کہو کہ قابو میں نہیں آتی۔ آ بھی جاتی ہے۔ اپنی تمام طاقتِ علم کے ساتھ سرنگوں کر دیتی ہے۔ مفتوح ہو کر

سر خرو کر دیتی ہے۔ اُسے محبت چاہیے۔ محبت کے منتر سے بہت کچھ رام ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔ محبت۔۔۔۔۔! ایک عام آدمی کو محبت کرنے والے کی نظر میں خدا کر دیتی ہے۔ کہانی بھی ایک Submission ہے۔ اطاعت ہے' رعایا ہے' مطیع رہنا کہانی کی مجبوری ہے۔ وہ اسی طرح حیات پا سکتی ہے۔

کہانی بلاشبہ ایک ماورائی نغمہ ہے۔ جو اس کی لے کے ساتھ ہم آہنگ ہوا وہ یقیناً کامیاب ہوا۔ کہانی سوہنی کمہارن کے چاک پہ گیلی مٹی کا پراگا ہے جس کو چاک پہ چڑھ کے بے بسی کا سرمست رقص کرنا ہوتا ہے اور پھر خالق کی مرضی کے مطابق شکل اختیار کرنی ہوتی ہے۔ خالق کی مرضی اور اختیار کی حدود بھی ہوتی ہیں۔ خالق کی لگن اور عشق کے کئی مراحل بھی طے کرنا ہوتے ہیں۔ عشق کی آنچ سے دھیرے دھیرے پختہ ہو کر محبوب کے ہاتھ تک جانا ہوتا ہے۔ میرے نزدیک قاری' لکھنے والے کا معصوم اور نازک اندام محبوب ہی ہوتا ہے۔ لکھنے والے کو محبوب کا مزاج شناس اور ناز بردار بھی ہونا چاہیے۔ ورنہ عشق تکمیل کے کسی مرحلے میں ہانپ کر بیٹھ جائے گا۔

چلیے کہانی لکھنے کو اندھا روگ ہی کہہ لیتے ہیں۔ اندر ہی اندر جڑ پکڑ لیتا ہے۔ آدمی کیا' کوئی بھی شناخت نہیں کر سکتا کہ درد کہاں ہے۔ پورا وجود جلتا ہو جاتا ہے۔ ایک ناقابلِ بیان کیفیت میں جس کو شاعرانہ تخلیق کاری کے "یارڈ سٹک" (Yard Stick) سے نہ پکڑا جا سکتا ہے نہ ماپا جا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ اس درد کو کھلے بندوں داد بھی نہیں ملتی۔ عوام الناس میں چرچا بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہ روگ لکھنے والے کا ذاتی مسئلہ ہوتا ہے۔ لکھنے والا "تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تُو" کے مصداق لکھتا ہے اور لکھتا رہتا ہے کہ یہ روگ اس کا انتہائی ذاتی معاملہ ہے۔۔۔۔۔ کوئی دبی دبی آہ یا کراہ دوسرے تک پہنچ جائے۔ دوسرے کے دل میں احساس کا دیا سا جلا دے۔ اب دیے میں روشنی کے ساتھ پگھلا دینے کی طاقت بھی ہوتی ہے۔ ایک سوختنی جلا بھی ہوتی ہے۔

کہانی ایک مشکل ذمہ داری بھی ہے جسے بے آبرو آزمائش کہیں تو بُرا نہیں لگنا چاہیے۔ بے آبرو اس لیے کہ کسی نے کسی کو حق نہیں دیا کہ وہ رطب و یابس سنا کر دوسروں کا وقت برباد کرے۔ جذبات کو انگیخت کرے اور بھٹکتا چھوڑ دے۔ کیوں کہ کہانی شاعری سے

بہر حال مختلف ہے۔ اسے Ridles کی آماجگاہ نہیں بنایا جا سکتا۔ اس میں ذہن نشینی کی لپک ہو تو اچھا ہے۔ ذہنی فراریت کی رمق بھی اُسے تہہ و بالا کر دے گی۔

کہانی چوری بھرا کٹورا ہے جسے ہیر ہزار ارمانوں سے خالص گھی میں تیار کر کے رانجھے کی بھوک مٹانے کے لیے لاتی ہے اور پھر محبت کے ساتھ لقمہ لقمہ رانجھے کے منہ میں ڈالتی ہے۔ ساتھ ہی اپنے ناز و انداز سے رانجھے کو گھائل اور قائل بھی کرتی ہے حتیٰ کہ عشق کی آگ دونوں میں برابر روشن رہتی ہے۔ اوپر سے منقش پنکھے کی مدھم مدھم ہوا کسی لمحے کو بھی بوجھل نہیں ہونے دیتی۔ عشق کی فضا برقرار رہتی ہے۔ دیر تک' زمانوں تک۔

کہانی جانو عیب جوئی ہے۔ کمزوریوں' زیادتیوں' فریب کاریوں' دھوکا دہیوں' جھوٹ' بے حیائی' خود غرضی' خود پسندی' خود نمائی' خود شناسی اور خود فراموشی کی نشان دہی ہے۔ خود کو اور دوسرے کو بھیتر تک ننگا کرنا' فطرت کو بے نقاب کرنا' دیکھنا اور دکھانا ہے۔

اور یوں کہانی لکھنے والے کا حوصلہ' ہمت' تجربہ' تجزیہ' ویژن' ماضی کا' حال کا اور مستقبل کا فکری ادراک اور مطالعہ ہے۔ اظہار پر ایک متوازن گرفت' الفاظ کے ظاہری' باطنی' عمیق اور رواتی معنی سے آگہی اور شناسائی ہے۔ لفظ کی حرمت کا احساس ہے' اُس کی آبرو ریزی نہیں۔ کہانی بلوغت ہے' نوخیزی نہیں۔ حقائق کی تلاش ہے' شرانگیزی نہیں۔ حیات کے رنگوں میں امتیاز ہے' رنگ آمیزی نہیں۔

کہانی اپنی ذات سے الگ ہو کر دوسرے کے قالب میں جینا ہے۔ دوسرے کی بات اپنی ہی بات ہو۔ دوسرے کا دُکھ درد اپنا ہی دُکھ درد ہو۔ لیکن یوں نہ ہو کہ خود کہے' خود ہی سنے۔ بلکہ دُنیا دیکھے' سنے اور سمجھے۔ اسی لیے میں کہانی لکھنے کو مصوری کہتی ہوں۔ رنگوں یعنی لفظوں کی حرمت برقرار رہنی چاہیے۔ انسان کی عزت اور وقار مجروح نہ ہو۔ انسان نے جو وقار اور اعتبار ہزارہا صدیوں کی جدوجہد کے بعد حاصل کیا ہے اُسے محض دھندلے رنگوں' اشاروں سے کھدیڑ کر جنگل کی طرف لے جانا۔۔۔ کسی بھی فن کی ناجائز کمائی کے مترادف ہے۔

کہانی کے بارے میں بعض ناقدین کی رائے ہے کہ لکھنے والا بالکل غیر جانبدار ہو کر لکھے۔

ہرگز جذباتی نہ ہو۔ صرف Operate کر کے صورتِ حال پیش کرے' کسی ماہر سرجن کی طرح۔ صورتِ حال پر تبصرہ کرنا اس کا منصب نہیں۔ اُس کا کام کیمرے کی آنکھ کی طرح تیکنیکی نتائج دکھانا ہے اُن کا تجزیہ پیش کرنا نہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ لکھنے والا صرف کیمرے کی مشینی آنکھ نہیں ہوتا اور نہ صرف نشتر چلا کر زخم کھول دینے والا سرجن۔ سرجن بھی انسان ہوتا ہے اور لکھاری بھی۔ سرجن' زخم کو کھولتا ہے اُس کی گھمبیرتا کو معلوم کرنے کے لیے تاکہ وہ دکھن اور درد کی اصل وجہ جان سکے اور صحیح علاج تجویز کر سکے۔ کوئی بھی سرجن بے درد نہیں ہوتا۔ وہ اپنے مریض کی طرح چیختا دھاڑتا نہیں مگر درد کی نوعیت کو سمجھتا اور سنجیدگی سے تجزیہ کر کے بتاتا ہے کہ درد کا باعث کیا ہے اور کون کون ذمہ دار ہے۔ وہ مریض کی کیفیت کو سمجھتا ہے پھر احتیاط کے ساتھ رائے دیتا ہے۔ لیکن کہانی کار رائے دینے سے احتراز کرے تو یہ کہانی کے حق میں بہتر ہے۔ کسی حادثے' واقعے' کردار' منظر کو موضوع بنا لینا ہی لکھنے والے کی رائے سمجھا جائے۔ وہ لکھتے لکھتے جب اپنے موضوع کو کسی کلائمکس سے گزار کر قاری کو انجام تک پہنچا دیتا ہے تو یہی اُس کی رائے ہے۔ یہی اُس کا نقطۂ نظر اور ہمدردی ہے۔ اس میں واویلا کیسا' کیا پروپیگنڈا اور کیا ذاتیات۔ اُس کی کامیابی اِسی میں ہے کہ وہ قاری کا ہاتھ سطر اوّل سے ہی پکڑ لے' اعتماد میں لے لے۔ زیادہ گم گشتہ بلندیوں اور چکروں میں لے جائے۔ گہری کھائیوں اور گڑھوں سے اجتناب کرے اور شدید جھٹکے لگانے سے بھی احتراز ہی کرے تو اچھا ہے۔ دورانِ سفر قاری کو بے جا صدموں سے بچانا بھی لازم ہے۔

کہانی لکھنا ایسے ہی ہے جیسے کاریگری۔۔۔۔۔ ذہنی کاریگری۔۔۔۔۔ کاریگر کا کام کسی طور سہل نہیں ہوتا۔ اُٹھتے بیٹھتے' سوتے جاگتے' کھاتے پیتے اُسے اپنا پروجیکٹ یاد رہتا ہے اور کہانی کی نوک پلک سنوارنے میں اُس کا ایک دوسرا Self ہمہ تن مصروف رہتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر پروجیکٹ شاہکار نہیں بنتا۔ لیکن لکھنے والے کی لگن اور محنت ایک عام موضوع کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے اور ذہن نشین کرا دیتی ہے۔ اس ذہن نشینی کے پیچھے جو بات متحرک بنتی ہے وہ ہے لکھنے والے کی نظر اور احساس۔ مطلب یہ کہ اس نے واقعے کو کس شدتِ احساس سے دیکھا' پرکھا اور قاری کو کس حد تک اپنے ساتھ لے کے

چلا اور ہم خیال بنایا۔ کس زاویے سے دیکھا اور کیوں؟ کیسی کیسی روشنی ڈال کر قاری کو اعتماد میں لیے چلتا رہا۔

ویسے تو ہر فنکار کی بنیادی خوبی یہی قرار پائی ہے کہ وہ اپنے Subject کے اظہار میں کیونکر کامیاب ہُوا اور کس حد تک دوسرے کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب رہا۔ لیکن کہانی کار سے تو فوری توقع یہی رکھی جاتی ہے کہ وہ کہانی کے پہلے جملے سے ہی قاری کی اُنگلی اس غیر محسوس انداز سے پکڑے کہ قاری کا فہمی اور جذباتی تقاضا بن جائے اور وہ انجام تک اپنے آپ کو ایک خوشگوار فریضے کی ادائی میں مبتلا سمجھے۔ کہانی ختم کرنے پر اُسے اپنے اندر خلا کے بجائے کچھ بھرا پُرا مثبت سا احساس ہو۔

زیرِ مطالعہ مجموعہ "جب بجا کنورا" کئی برس پہلے کتابت کی منزل طے کر چکا تھا۔ از سرِ نو پڑھا تو پتا چلا کہ اب بھی ان کہانیوں کو کتابی شکل میں منظرِ عام پر لانے میں کوئی حرج نہیں۔ ادب کے قارئین ہمیشہ قلیل تعداد میں ہوتے ہیں۔ ویسے میں کبھی بھی "مقبول" لکھنے والوں میں شمار نہیں ہوئی۔ البتہ لکھنے والوں کی قطار میں خود کو دیکھنا ہمیشہ میری تمنا رہی۔ اِسی تمنا کے سہارے ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی افسانوں کا مجموعہ مارکیٹ میں لانے کی جرأت کر رہی ہوں۔ اِس کی پذیرائی ویسی ہی ہو گی جیسی میری پہلی تحریروں کی ہوئی۔

میں پذیرائی کی دیرپائی کی خواہش مند ہوں۔ یہی میری کوشش و کاوش ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی زعم سے محفوظ رکھے اور رہنمائی کرے۔ آمین

فرخندہ لودھی

مُنّی کیسے مرے؟

مُنّی کی جبلتیں اور پھر شباب کی طرف بڑھتے قدم کسی طور قابو میں نہیں آ رہے تھے۔ عفیفہ بے حد پریشان تھی اور باپ الگ حیران کہ اس لڑکی کی اٹھان کیسی ہے۔ جوان ہو گی تو اسے سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ وہ مُنّی کی آنکھوں کی طرف دیکھتا تو اندر تک ہل جاتا۔ عفیفہ بولتی تو نہ تھی مگر فکر مند سی ہو کر قیاس آرائی ضرور کرتی۔

وہ مرد جو بیٹیوں کے باپ ہوتے ہیں وہ بیٹیوں کی ہر حرکت کا ذمہ دار بیویوں کو ٹھہراتے ہیں۔

"دیکھ عفیفہ دیکھ! تیری مُنّی کی آنکھ میں ابھرتے جھلملاتے سوالوں کا جواب میرے پاس نہیں۔ تو نے اسے کس ڈھنگ سے جنا ہے۔ دوسرے بچوں کی نظر ایسی نہیں۔ نہ تو یہ سب سے بڑی ہے اور نہ چھوٹی کہ لاڈ پیار میں بگڑ گئی۔"

اور عفیفہ عام گرہستنوں کی طرح تسلیم کے انداز میں جواب دیتی۔

"شاہدہ کے ابو! میں بھی یہی سوچوں ہوں کہ میں نے اسے کس ڈھب سے کوکھ میں رکھا۔"

عفیفہ کو وہی گرہستنوں والا خوف گھیر لیتا۔ کہیں میاں یہ شک نہ کر لے کہ وہ اس کا نطفہ نہیں۔ اللہ "ستار العیوب" ہے اور قیامت کے روز لوگوں کے نام والد سے نہیں ماں کے نام سے پکارے جائیں گے۔ اس پر ہر مسلمان عورت مرد کا ایمان ہے۔

عفیفہ پاؤں کے تلووں سے لے کر دماغ کی انتہاؤں تک اور جلد کی حساسیت سے لے

کے دل کی گہرائیوں تک ایک ماڈل شوہر پرست عورت تھی۔ اس نے کبھی بھی' عمر کے کسی موڑ پر' کسی دوسرے لڑکے یا مرد کو اپنے نصف بہتر کے روپ میں نہیں دیکھا تھا۔ حتیٰ کہ جب وہ چھ برس کی تھی اور بی بی جی کے پاس اسے اور انوارالحق کو بسم اللہ کے بعد باقاعدہ پڑھنے کے لیے بٹھا دیا گیا تھا تو وہ جانتی تھی کہ انوارالحق اس کا بھائی' دوست یا پڑوسی نہیں۔ اس کا منگیتر ہے۔ منگیتر کیا ہوتا ہے' وہ نہیں جانتی تھی مگر اس نے مان لیا تھا' تسلیم کر لیا تھا کہ وہ انوار سے منسوب ہے۔

عفیفہ جب ذرا سیانی ہوئی تو اپنے ماحول میں مردوں کے متعلق جو علم وہ سمیٹ سکی وہ یہ تھا کہ مرد شکی مزاج ہوتے ہیں۔ انہیں شک کا کوئی موقع نہیں دینا چاہیے۔ عورت کی نجات شوہر کی اطاعت میں ہے۔ عفیفہ نے شوہر کی اطاعت گزاری' وفاکیشی اور فرمانبرداری میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ انوارالحق پر اس کے کیا حقوق ہیں اور انوارالحق پر اس کی طرف سے کیا فرائض عائد ہوتے ہیں اس نے کبھی غور نہیں کیا تھا اور نہ اس کی ماں یا اس کی ماں کی ماں نے لڑکیوں کو اپنے حصار سے نکلنے کا سبق دیا تھا۔ ذہن میں ایک تصور تھا کہ لڑکی بیوی بننے کے لیے پیدا ہوتی ہے۔ بیوی بن کر اسے بچے جننے چاہییں۔ یہی اس کا رول ہے۔ یہ نہ کر سکے تو سزاوار ہے' ذمہ دار ہے۔

اپنی بڑی لڑکیوں کو انہوں نے تعلیم نہیں دلوائی تھی۔ شوق آیا نہ خیال۔ پھر جب قریب کے ایک مکان میں ایک اسلامیہ سکول کھل گیا تو جانے کیوں عفیفہ' مُنّی کو سکول میں بھرتی کرا آئی۔ مُنّی کافی باغی باغی جان پڑتی تھی۔ ضد کرتی' اکڑ جاتی۔ بات بے بات نکتے پکڑتی۔ بڑوں کو عاجز کر دیتی۔

گھر میں دینی تعلیم' لڑکیوں کے لیے' اگرچہ بنیادی بات تھی مگر مُنّی کے لیے خاندان کے کسی فرد کے پاس وقت نہ تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ اسے سکول میں بھرتی کروا دیا گیا۔ تاکہ اپنی جان' اپنا دماغ خود چاٹے۔ اس سے بڑا بھائی اور چھوٹا بھائی لڑکے ہونے کے ناتے ماں کی ممتا' باپ کی شفقت اور بہن بھائیوں کی توجہ کے زیادہ مستحق تھے۔ سو سکول میں مُنّی کا جی بہت لگا۔ یہ ڈھیر ساری لڑکیاں۔ کوئی ہنستی' کوئی روتی۔ کوئی دوستی کرنے کو بڑھتی۔ مُنّی کو پہلے پہل تو بہت لطف آیا لیکن جب سکول کے تقاضے بڑھنے لگے تو وہ اکتا گئی۔ مثلاً آپا

جی کہتی تھیں:

"آج کون کون بچی نماز پڑھ کر آئی ہے؟"

پھر جو لڑکیاں ہاتھ کھڑا کرتیں ان کو مسلمان لڑکیاں کہہ کر الگ بٹھا دیا جاتا اور جو ہاتھ کھڑا نہ کرتیں ان کے پھول سے گالوں پر دائیں بائیں زوردار طمانچے رسید ہوتے اور انہیں کافر کہا جاتا۔ کافروں کی قطار الگ بن جاتی۔

"اور یہ تو وہی ہوا جو گھر میں ہوتا ہے۔"

مُنّی رونے دھونے کے بعد اکثر سوچا کرتی تھی۔

رفتہ رفتہ کافر لڑکیوں کی تعداد کم ہونے لگی۔ مُنّی کبھی کافر لڑکیوں میں شمار ہو جاتی اور کبھی مسلمانوں میں۔ آپا جی اس کو کوئی اہمیت بھی نہ دیتی تھیں کیوں کہ اس کی امی کا تعلق نہ کسی امیر کبیر گھرانے سے تھا اور نہ اس کی اماں آنے بہانے آپا جی کی سہیلی بننے چلی آتی تھی۔ نہ مُنّی میں کوئی اور خوبی تھی جو اسے نمایاں کرتی۔ سادہ شکل' سادہ لباس۔ گفتگو میں شوخی اور حرکتوں میں گستاخی اور شرارت کچھ بھی تو نہ تھا اس میں۔ ہاں کبھی کبھی جھوٹے کو جھوٹا کہنے پر اڑ جاتی تو گھر اور سکول' دونوں جگہ' وافر گھونسے مکّے کھانے پڑتے۔ کوئی کہتا:

"ڈھیٹ ہے۔"

دوسرا کچھ ترس والے لہجے میں فیصلہ سنا دیتا:

"تھوڑا دماغ ہے بے چاری کا۔"

ایک دن الماس کے معاملے میں تو وہ گویا پھنس ہی گئی۔ اس کی کلاس فیلو الماس ان کے پچھواڑے گھر میں رہتی تھی۔ تقریباً اس کی ہم عمر تھی۔ دونوں گھروں میں آنا جانا بھی تھا۔ (الماس کا گھر ان کے گھر سے کشادہ تھا۔ بڑا سا آنگن' تین طرف بیرک نما عمارت۔ برآمدے اور ان کے پیچھے کمرے) گرمیوں کی شام میں جب الماس کے کچے آنگن میں نوکر چھڑکاؤ کر کے مسہریاں لگا دیتے تو اسے بہت رشک آتا وہ اپنی چھت کی دیوار کے جھروکوں سے دیکھتی اور دیکھتی چلی جاتی اور اس کا دماغ بھیگی مٹی کی خوشبو کو پہچانتا اور بدن میں اپنائیت کی جھرجھری سی پھر جاتی۔ سپید چاندنی الماس کے آنگن میں پھیلتی۔ الماس کے

بہن بھائی مل کر خوب دھما چوکڑی مچاتے۔ سپید چادریں بچھے پلنگوں پر۔ اچھلتے کودتے۔ تب ان کی نانی اماں یا کوئی باجی انہیں کوئی کہانی سنانے لگتی تو وہ ہوں ہاں کرتے ایک ایک کر کے سو جاتے۔ منّی کو یہ سب بہت دلکش لگتا تھا۔ ان کے اپنے یہاں کھانے پینے' سونے جاگنے کے اوقات مقرر تھے۔

عشاء کی نماز کے بعد بڑے بھائی اور ابا گھر آتے تو ضروری تھا کہ سب بچے سو چکے ہوں۔ بچوں کو صبح سات بجے موسم سرما میں' اور چھ بجے موسم گرما میں بستر چھوڑ دینا چاہیے۔

"عفیفہ! نماز کی پابندی کراؤ ان سے----"

ابا یہ فقرہ تقریباً ہر صبح دہراتے۔ منّی اور اس کا بھائی لپ جھپ منہ پر چھینٹے مارتے' ہاتھ پاؤں بھگوتے۔ نماز کے لیے لپکتے تو گھر کا کوئی فرد للکارتا:

"ارے' اب کیا ٹکریں مارو گے۔ ٹیم تو نکل گیا۔"

سو وہ کبھی نماز پکڑ لیتی' کبھی چھوٹ جاتی۔ سکول میں وہ سچ سچ کہہ دیتی:

"نہیں پڑھی۔"

مگر الماس کو تو اس نے کبھی اپنے سے پہلے اٹھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ جب وہ ناشتہ کر چکتی اور الماس کے آنگن میں جھانکتی تو دکھتا کہ وہ ابھی آنکھ کھولنے کی تیاری کر رہی ہے۔ یا جماہیاں لیتے ہوئے بستر چھوڑ رہی ہے۔ برآمدے کے ایک طرف الماس کی ماں ناشتا لگائے بیٹھی ہے اور باری باری آوازیں دے رہی ہے۔

"آؤ' ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" یا "گرم ہوا جا رہا ہے۔" وغیرہ۔

منّی جانتی کہ الماس کلاس میں کافر کہلانے سے ہمیشہ بچی رہی۔ اس کا ہاتھ سب سے اونچا ہوتا تھا اور لمبی سی گواہی جس میں اور کئی آوازیں شامل ہو جاتیں:

"جی------ آپا جی۔"

الماس اور اس کی ہم آوازوں کو جھوٹا ثابت کرنے میں وہ کئی بار کافر کہلائی تھی اور اب تو اس نے ٹھان لیا تھا کہ وہ الماس کی اور اس کی سہیلیوں کی حقیقت آپا جی پر واضح کر کے رہے گی۔ ایک دن تو اس نے چلّا کر کہا:

"آپا جی! یہ سب لڑکیاں جھوٹ بولتی ہیں۔ الماس کو تو میں خوب جانتی ہوں۔ دھوپ پھیلنے تک یہ سوئی ہوئی ہوتی ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے کئی بار اس کے آنگن میں جھانک کر-----"

"جی-----میں نماز پڑھ کر پھر سو جاتی ہوں۔"

یہ ایک دوسرا جھوٹ تھا جسے آپا جی نے سچ مان لیا۔ منّی کو اپنی شکست کا انتہائی تلخ احساس ہوا۔

تب منّی اور اس کی ایک سہیلی ایک دوسری کا منہ تک کر رہ گئیں-----

اب یہ ہوا کہ ہر روز ان کا شمار قطار اچھی بچیوں میں ہونے لگا جو حقیقت میں اچھی نہیں تھیں۔ گھر سے پیسے چرا کر لاتی تھیں۔ سکول کے باہر چھابڑی والوں سے نوع بنوع چیزیں خرید کر' دکھا دکھا اور ترسا ترسا کر کھاتیں۔ کھٹ مٹھی املی اور کیریاں۔ لڈو پیٹھیاں اور جانے کیا کیا۔ منّی کو ان سب کے ذائقے معلوم تھے مگر گھر کا دستور کچھ ایسا تھا کہ ماں ہر شے گھر میں تیار کر کے کھلاتی۔ اوپر سے یہ احسان بھی کہ گھر کی بنی ہوئی چیزیں زیادہ صاف ستھری اور خوش ذائقہ ہوتی ہیں۔ چھابڑی والوں کا کیا ہے اِدھر ناک صاف کی اُدھر سودے میں ہاتھ ڈال دیا۔ سڑک کنارے پیشاب کرتے ہیں-----چھی-----گندے کہیں کے' بغیر ہاتھ دھوئے سودا بیچنا شروع کر دیتے ہیں۔

اور یہ حقیقت تھی کہ منّی کو بھی ان سے کراہت آتی تھی۔ تاہم خود خرید کے کھانا اور ہمجولیوں کے ساتھ آدھی چھٹی کے وقت چہلیں کرنا اور چٹخارے لینا۔ ان باتوں کا اپنا مزہ تھا۔ یہ مزا لینے کے لیے ان کے گھر میں بچوں کو ہر روز جیب خرچ دینے کا رواج نہیں تھا۔ منّی کو اپنی کم مائیگی کا تجزیہ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ماں کا اتنا کہہ دینا کافی تھا:

"چٹورپن اوچھوں کا کام ہے۔"

"اوچھا کیا ہوتا ہے-----" اس نے جھٹ سے سوال کیا۔

"مطلب کہ نچلاپن"

"نچلاپن کس کو کہتے ہیں؟-----" منّی نے پھر پوچھا۔ ماں نے زچ ہو کر ایک چپت اپنے ماتھے پر اور دوسری منّی کی گُدی میں لگا دی-----

"مت کھا میرا مغز۔"

مُنّی اس وقت پلنگ کی پٹی پکڑے فرش سے پاؤں اٹھا کر جھول رہی تھی۔

"تجھے سکول میں اس لیے داخل کیا ہے کہ اپنی استانی کا دماغ چاٹو گھر والوں کا نہیں۔"

"لیکن آپا تو مجھے ہر روز کافروں کی قطار میں کھڑا کر دیتی ہیں۔"

"ہائیں۔۔۔۔۔کیا۔۔۔؟ کافروں کی قطار کہاں سے آ گئی سکول میں؟"

ماں کے ہاتھ سے تیلے دانی چھوٹ گئی جس میں سے وہ کتنی دیر سے سوئی تلاش کر رہی تھیں۔

"تم کیا کہہ رہی ہو۔۔۔۔ پتا بھی ہے کچھ۔"

اب مُنّی اُچک کر ماں کے گھٹنے پر بیٹھ چکی تھی۔ اس نے ماں کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اپنی طرف کھینچ لیا اور کھل کھل ہنس پڑی۔ اسے ماں کے بھونچکا رہ جانے پر ہنسی آ رہی تھی۔ کیسا لاجواب کیا تھا اس نے ماں کو۔۔۔۔ اس کا رویہ فاتحانہ تھا۔

"اچھا بول! آپا جی تجھے کافروں کی قطار میں کیوں کھڑا کرتی ہیں۔۔۔۔ اور یہ آتے کہاں سے ہیں اتنے کافر۔۔۔۔!"

"لو۔۔۔۔ آپ کو یہ بھی نہیں پتا۔۔۔۔ میں بتاتی ہوں۔۔۔۔ جو صبح اٹھ کر نماز نہیں پڑھتا وہ کافر ہوتا ہے۔" مُنّی نے خوب جم کر جواب دیا۔

"تو پھر تو پڑھا کر نہ نماز۔"

مُنّی کوئی اقرار کیے بغیر گود سے اتر گئی۔ اس کی توجہ رفعت آپا کی سلائی مشین نے اپنی طرف کھینچ لی تھی۔ مشین کی چمکتی گراری کے چمکدار پہیے میں اپنا لمبوترا چہرہ دیکھنا اسے ہمیشہ حیران کن اور اچھا لگتا تھا۔ جبکہ آئینے میں اسے اپنی صورت ویسی ہی نظر آتی تھی جیسی کہ وہ تھی' کوئی بگاڑ یا بہتری نظر نہیں آتی تھی۔

اگلے دو دن ماں کی تاکید کا باقاعدہ اثر نظر آیا۔ صبح جلدی جلدی اٹھنا' وضو کرنا' نماز پڑھنا اور پھر سرخرو سرخرو سا پھرنا۔ کلاس میں لمبے سُر اور اونچے ہاتھ کے ساتھ گواہی دینا۔

"جی۔۔۔۔ آپا جی۔۔۔۔"

آپا جی کو اس حقیقت سے کوئی غرض نہ تھی کہ کون سچ مچ "سچ" بول رہی ہے۔ ان کے

لیے یہی شہادت کافی تھی کہ کون ڈٹ کر شہادت دیتی ہے۔

گرمیوں کے دن تھے۔ یہی جولائی اگست کے حبس والا موسم۔ گرمی بلا کی پڑتی تھی۔ دھوپ نکلتی تو ابال اٹھتا۔ لگتا انسان کو بھاپ کے چیمبر میں ڈال دیا گیا ہو۔ لمبی دوپہروں میں جب بڑے لوگ استراحت سے لطف اندوز ہو رہے ہوتے۔ بچے آزادانہ اپنی من مرضی کے کھیلوں میں مشغول ہو جاتے۔ مثلاً لڑکے چھپن چھپائی' بل گولیاں' چھو چھاکنارا یا' شکر بھجی وغیرہ۔۔۔۔ لڑکیاں وہی گڑیوں سے کھیلنا۔ خانہ داری کی نقل' بمن بمن یا پھر خانقاہوں پر حاضری' چڑھاوے' منتیں دعائیں وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔ ایسی دوپہروں میں مُنّی بہت پریشان ہوتی۔ بہت گھومنے اور آوارہ گردی کرنے کو جی چاہتا۔ صحن سے اٹھے چھت پر چلے گئے۔ ہمسایوں کے گھروں میں جھانک لیا۔ پردوں کے اوپر سے گلی میں بے وقوفوں کی طرح جھانکتے اور بڑبڑاتے رہنا۔ اونچا بولنے اور گلی میں جا کر کھیلنے کی سختی سے ممانعت تھی۔ ابا آواز سنتے ہی گرجتے:

"کون ہے چھت پر۔۔۔۔" اللہ کیسی دہلا دینی والی آواز تھی ان کی!

سکول میں نماز کی پابندی کے ساتھ دینی تعلیم اور تربیت پر انتہائی زور تھا۔ لازم تھا کہ چھوٹی سے چھوٹی لڑکی بھی برقعے میں خود کو چھپا کر چلے۔ یہ نہ ہو تو کھلی چادر سے سارا جسم ڈھانپ کر باہر نکلے تاکہ پہچانی جائے کہ اس کا مذہب کیا ہے۔ لہٰذا بعض لڑکیاں بڑی بیبیوں کی طرح نقاب گرا کر' ہاتھ کے ساتھ نقاب گردن تک کس لیتیں تاکہ ہوا یا حرکت سے چہرے کا کوئی حصہ نہ کھل جائے۔ کالے نقاب میں سے ان کی ناک' ہونٹ' گال اور ماتھا یوں نظر آتا جیسے تارکول سے بنا ہوا بت چلا آ رہا ہو جس میں کہیں کوئی کریکٹر واضح نہیں ہو پاتا۔ مُنّی کو ایسے بے ہنگم سیاہ بت دیکھ کر زور کی ہنسی آ جاتی۔ اور وہ لپک کر کسی ایک کا ہاتھ پکڑ لیتی:

"تم کشور ہو نا۔۔۔۔؟"

"نہیں۔۔۔۔" لڑکی ہاتھ چھڑا لیتی۔

"مقبول بیگم ہو۔۔۔۔؟"

"ہٹ دور ہو۔۔۔۔" تارکول کا بت غصے سے بولتا "خود تو بے شرم کھلے منہ پھرتی ہے

دوسروں پر ٹھٹھا کرتی ہے۔۔۔۔ جنمی۔"

آواز کو پہچان کر منّی کھل کر قہقہہ لگاتی۔

"تو مجیدہ ہے' مجیدہ۔"

اگلے روز منّی کا تمام وقت کلاس میں کھڑے ہو کر گزرتا۔ آپا جی تھوڑی دیر بعد چوٹی سے پکڑ کر دو تین جھونٹے اور دو ایک دھپ کمر میں رسید کرتی رہتیں۔ سکول کی' بلاوی' ماں کے پاس صبح ہی شکایت لگا چکی ہوتی۔

"بی بی جی! یہ تمہاری بیٹی کا پنڈا تو جیسے مار کھانے کے لیے پھڑکتا رہتا ہے۔ بہانے بہانے مار پھٹکار۔۔۔۔ آپا جی نے کہا ہے سوال کرنے میں بہت ہوشیار ہے۔ اسے قابو میں رکھو۔۔۔۔ ورنہ دن دکھائے گی۔۔۔۔"

اس قسم کی رپورٹیں آئے دن گھر میں پہنچتی تھیں۔ منّی کی ماں تو شاید بنی ہی پریشان رہنے کے لیے تھی۔ ابا کو بھی بدن میں سنسنی سی ہونے لگتی۔ اور وہ جہاں بیٹھے ہوتے وہیں سے بیوی کو للکارتے۔

"تو خواہ مخواہ لڑکی کو سکول میں بھرتی کرائی پھر رہی ہے۔ پہلے یہ دیکھ اس کا بھیجا ہے بھی یا نہیں۔۔۔۔ مجھے تو خالی کھوپڑی لگتی ہے۔"

ایسا ماحول ہوتا تو اس سے دو جگہ بڑی بہن شاہدہ جو اب ہانڈی چولہے کی ہو کر رہ گئی تھی اور ناظرہ قرآن فر فر پڑھ سکتی تھی' ماں کا دل مزید اپنی طرف کرنے کے لیے کہتی۔

"لم ڈھینگ ہو گئی ہے۔ ابھی "تلک الرسول" لیے پھرتی ہے۔ باقی ستائیس کون پڑھے گا۔ تیرے فرشتے۔ نہانے دھونے لگو گی تو کیسے ختم کرو گی قرآن شریف۔ لڑکیوں کے لیے بہت مشکل ہے۔۔۔۔ ہے نا امی۔"

"میری عاقبت خراب کرے گی کمبخت۔ تعلیم و تربیت تو والدین کا ذمہ ہے۔ اللہ پوچھے گا تو مجھ سے پوچھے گا۔ گھما پھرا کے پوچھے گا۔"

"ہاں ہاں۔۔۔۔ پوچھے' ضرور پوچھے' مجھ کو کیا۔" منّی جواباً بڑبڑاتی مگر اتنا دھیما کہ کسی کو کچھ سمجھ نہ آئے اور ذہن میں ابلتے غصے کی کچھ بھاپ بھی نکل جائے۔

منّی ایسے موقعوں پر اگرچہ تنہا رہ جاتی مگر جس تس کا منہ دیکھتے ہوئے اسے رونے کے

بجائے ہنسی آتی اور وہ سوچتی۔ اللہ میاں! تو نے میرا من اوروں جیسا کیوں نہیں بنایا۔ وہ سبق کو اس طرح کیوں نہیں یاد کرتی جس طرح سلیمہ یاد کرتی ہے۔ جھوم جھوم کر۔۔۔۔ لٹک لٹک کر اور چلا چلا کر۔

"فان طلقہما فلا تحل لہ من بعد حتی تنکح زوجا" وغیرا۔

سلیمہ کے چہرے پر کتنا اعتماد' تقدس اور نور ہوتا ہے جیسے فرشتوں سے باتیں کر رہی ہو۔۔۔۔ یا خدا کے عین سامنے میں چلی گئی ہو۔

اسے سلیمہ اور مجیدہ پر ہمیشہ حسد آمیز رشک آتا۔ وہ ایسا کیوں نہیں کر پاتی۔ وہ تصوراتی طور پر اتنی اونچی کیوں نہیں اٹھ سکتی کہ حوروں کے جھرمٹ میں چلی جائے جیسے سلیمہ' جیسے مجیدہ یا جیسے اس کا تایا زاد بھائی راحیل جسے اس نے اکثر کہتے سنا۔

"میں تصور میں روضۂ رسولؐ پر نظر باندھ لیتا ہوں اور رٹتا رہتا ہوں۔"

اس نے راحیل کے کہنے کے مطابق لاکھ نظر باندھی لیکن پھر وہی شیطانی خیالات۔ رابعہ کے پاس میم گڑیا ہے۔ اسے شلوار قمیض پہنادیں تو کیسی لگے۔ اس کے ماموں نے لندن سے بھیجی ہے۔ مہنگی ہوگی۔ ہم نہیں خرید سکتے۔ یہاں تو ملتی بھی نہ ہوگی۔ چھوڑو جی۔

وہ چیخنے لگتی۔ اتنی بلند آواز میں چلاتی کہ کنپٹیوں کی رگیں پھٹنے لگتیں۔ اور بندھی ہوئی نظر کا خیال خام ہو کر رہ جاتا۔ ڈانٹ پھٹکار کھانے کی عادت تو پڑ گئی مگر اچھی لڑکی بننے کی عادت کسی طور پڑتی ہی نہ تھی۔ بعض اوقات وہ بہت خشوع خضوع سے دعا مانگتی۔

"اللہ میاں جی! مجھے بھی اچھی لڑکی بنا دے۔ الماس جیسی۔۔۔۔ سلیمہ یا راحت جیسی۔۔۔۔ دیکھ اللہ میاں تو جو چاہے۔ مجھے اچھی لڑکی بنانا تیرے لیے کچھ مشکل نہیں۔ بنا دے نا۔۔۔۔!" وہ سیپارے پر جھکی ہوئی سبق رٹنے کی بجائے ایک ہی فقرہ کہے جا رہی تھی۔

"بنا دے نا!۔۔۔۔ بنا دے نا۔۔۔۔"

اور تبھی ایک تیکھی چپت عین ٹانٹ پر لگی۔ اماں جانے کب سے اس کے پیچھے کھڑی تھیں۔

"الٹے کاموں میں بہت دل لگتا ہے۔ یہ تو دہرائی کر رہی ہے۔۔۔۔ بنا دے نا! بنا دے

تا۔۔۔۔ کیا بنا دے؟"

منّی کی نقل اتارتے ہوئے اماں نے گدی میں ایک اور جما دی۔

"کیا بنا دے اور کون بنا دے؟"

"اللہ میاں۔۔۔۔" منّی کے جو جی میں تھی کہہ دی۔

"کمبخت! میں نے تجھے گڑیا بنا کر دی تو نہ کھیلی اس سے۔ پھر گڈا بنا کر دیا۔ پھر ان کی پوتلیاں (گڈے گڑیا کی اولاد) بنا کر دیں۔۔۔۔ پر پتا نہیں تو کیوں نہیں پرچتی (بہلتی) ان چیزوں سے؟۔۔۔۔"

"یہی تو کہہ رہی تھی میں اللہ میاں سے۔ دُعا کر رہی تھی۔۔۔۔" منّی نے لکڑی کی منقش رحل میں پڑے سیپارے پر ایک بار پھر سطر در سطر داہنے ہاتھ کی شہادت کی انگلی دوڑانی شروع کر دی اور خوب زور لگا کر گلا پھاڑا۔

"صمّ" بکمّ" عمیٌ" فہم لا یرجعون"

اماں دوبارہ گھرداری کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ برآمدے کی داہنی بغل میں بچھے تخت پر رفعت آپا اور شاہدہ باجی نے اپنی عادت کے برعکس ماں بیٹی کی گفتگو کی طرف بھی کوئی دھیان نہ دیا۔ منّی نے رشک بھری نظروں سے بڑی بہنوں کی طرف دیکھا۔ رفعت آپا اور باجی شاہدہ کتنی کھری ہیں۔۔۔۔ بچی بالکل بچی۔۔۔۔ منّی کے دل میں عقیدت کے رنگین بُلبلے سے بننے اور ٹوٹنے لگے۔ عجب احترام اور مناسبت کی فضا نے اسے اپنے نرغے میں لے لیا۔ اور وجود میں امنگوں کی تھرتھراہٹ سی پھیل گئی۔ ایک بار پھر وہ سبق یاد کرنا بھول گئی۔

اگلے دن ماں کو جانے کیا سوجھی۔ چولھے کے لیے مٹی گوندھتے گوندھتے' انھوں نے ایک کوری ڈبل اینٹ پکڑی۔ خوب اچھی طرح دھوئی اور پاک صاف کی۔ تب اس اینٹ کے کھپے میں گندھی ہوئی مٹی بھر دی۔ مٹی کو ابھار دیا بالکل قبر کی طرح۔ اوپر سے خوب لیپ پوت دیا۔ منّی اور اس کا بھائی برآمدے میں بیٹھے چھینوں کا کام کر رہے تھے۔ منّی کی نظریں بار بار ماں کو کام کرتے دیکھنے لگتیں۔۔۔۔ وہ کیا بنا رہی تھیں۔ پوچھنے کے لیے اس

کا دل بے چین تھا۔ چاہتی تو یہ تھی کہ لپک کر دیکھ ہی آئے لیکن شاہدہ باجی قریب ہی بیٹھی کشیدہ کاری میں محو تھیں اور بھائی اپنی کاپی پر کتاب سے ورق پر ورق نقل کرنے میں مصروف تھا۔ اماں جب اینٹ کو بڑے احترام سے اٹھا کر دیوار کے ساتھ بنے ہوئے تھڑے پر رکھ رہی تھیں تو مُنّی سے رہا نہ گیا۔ جہاں بیٹھی تھی وہیں سے چیختے ہوئے پوچھا:

"اماں! اماں! کیا بنا رہی ہو؟"

"تمہارا سر۔۔۔۔" اماں نے بیزاری سے جواب دیا۔ لیکن مُنّی ماں کے پاس پہنچ چکی تھی اور برابر سوال کر رہی تھی۔

"کہاں ہے میرا سر؟ کیوں بنایا میرا سر؟ کس لیے بنایا میرا سر؟"

اماں کے ہاتھ کیچڑ مٹی میں لت پت تھے ورنہ وہ مُنّی کے سر پر ایسی جھانپڑ لگاتی کہ مُنّی ٹھنڈی پڑ کر، سر سہلاتی واپس اپنی جگہ پر پہنچ جاتی۔

رفعت آپا جو ابھی ابھی کچن سے فارغ ہو کر شاہدہ کے پاس آ کر بیٹھی تھیں۔ ان کے درمیان کیا مکالمہ چل رہا تھا؟ مُنّی کے کان کھڑے ہو گئے۔ دونوں بہنیں اوپر تلے کی تھیں اور گھر کے کاموں میں یوں جتی رہتی تھیں جیسے وہ صرف اسی مقصد کے لیے پیدا کی گئی ہوں۔ اماں صحن کی مشرقی دیوار کے سائے میں بیٹھی چولھا چوکا لیپنے کے علاوہ کیا بنا رہی ہیں۔ کسی کو جاننے کی جستجو نہ تھی۔ ہر کوئی اپنے اپنے کام میں مگن تھا اور مُنّی بھی انہماک دکھانے پر مجبور تھی۔

پھر مُنّی کو کہا گیا کہ وہ دھنکی ہوئی روئی سے پھولوں کی لڑی بنائے جب ایک لمبی لڑی تیار ہو گئی تو یوں لگتا تھا جیسے موتیے کی کلیوں کا ہار۔

"اوہ، چیز کیا سے کیا بن جاتی ہے۔" موتیے کی لڑیاں دیکھ دیکھ کر مُنّی کا دل اک نئی خوشی اور تھرل کا تجربہ کر رہا تھا۔ پھر اس نے رنگین کاغذوں کے مختلف شکلوں کے پھول کاٹے، سہرے بنائے۔ یہ سب کچھ رفعت آپا اور شاہدہ باجی کی مدد سے بن رہا تھا۔

"ہم یہ سب کچھ کیا بنا رہے ہیں۔۔۔۔؟"

اس نے اور ماجد نے ایک ساتھ سوال کیا۔

"بس۔۔۔۔ بنا رہے ہیں کچھ۔۔۔۔"

"کیوں؟--- مُنّی بے تاب تھی--- "آخر کیوں؟"

"بس یہ ایک راز ہے۔ مگر تو اتنی بے چین نہ ہوا کر مُنّی۔ کچھ باتیں جیسی ہیں ویسی مان لینی چاہئیں۔"

رفعت آپا دیکھ رہی تھیں کہ ماجد دوبارہ اپنے کام میں جت چکا ہے۔

"جیسی ہیں ویسی مان لینی چاہئیں۔ مگر کیوں؟" مُنّی نے پھر سوال کیا۔

"ایک تو تیری "کیوں کیوں" اور "بتاؤ بتاؤ" نے ہمیں بھنا رکھا ہے۔ اماں بھی تجھے اسی وجہ سے ناپسند کرتی ہیں اور ابا جو چڑاتے ہیں سو الگ۔ کہتے ہیں--- بھلا کیا کہتے ہیں تیرے لیے؟" رفعت آپا نے پوچھا۔

"اٹھان ٹھیک نہیں۔" مُنّی نے جھٹ سے رٹا رٹایا فقرہ بول دیا۔

"ہاں----"

رفعت آپا اور شاہدہ باجی کی آپس میں دوستی تھی۔ مگر طبیعتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ رفعت سنجیدہ اور بردبار تھی جب کہ شاہدہ ہوشیار چالاک اور قدرے مکار تھی۔ وہ شکایت لگانے اور بھکانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔ بات بات میں طنز اور خودستائی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ماں باپ کو چٹکیوں میں مطمئن کر لیتی اور ان کی نظر میں اچھی بنی رہتی۔ رفعت کے متعلق والدین کا خیال تھا کہ وہ اطاعت شعار اور بی بی بیٹی ہے۔

اگست کے آخری ایام کی شام خاصی بھیگی ہوئی اور ملگجی تھی۔ آنگن کے ایک کونے میں گندھے ہوئے آٹے کا چوکھیا دیا ٹمٹما رہا تھا۔ مُنّی آنگن کے صدر دروازے میں داخل ہوتے ہی دیے کی طرف کھنچتی چلی گئی۔ اسے حیرت اور جوش نے پاگل کر دیا تھا۔

"اللہ اللہ--- کتنا خوبصورت ہے۔ کتنا اچھا لگ رہا ہے۔"

اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا جب اس نے دیکھا کہ آنگن کے کونے میں ایک چھوٹا سا مزار ہے۔ چھوٹی سی قبر پر ہرے رنگ کی گوٹے کناری والی چادر پڑی ہے۔ قبر کے تعویذ میں آٹے کا چوکھیا چراغ روشن ہے۔ مزار کے چاروں طرف ٹہنیوں اور ہرے پتوں کی باڑ ہے۔ باڑ پر دھنکی ہوئی روئی سے بنے موتیا کے ہار پڑے ہیں۔ ہری چادر پر بھی پھولوں کی لڑیاں اور پتیاں نچھاور ہیں۔ چھوٹی سی درگاہ کا ایک صدر دروازہ پھولوں اور تکیے کے

سہروں سے سجا ہے۔ چاروں کھونٹوں میں مینار ہیں کہ مزار کے رعب و دبدبے میں اضافہ کر رہے ہیں۔ صدر دروازے میں ایک گنڈا بیٹھا ہے۔ مزار کا آنگن چھوٹے بڑے گڈے گڑیوں سے بھرا ہے۔ عطر پھلیل کی خوشبو ہر طرف پھیلی ہے۔

استعجاب سے مُنّی کے حلق میں ہر سوال اٹک گیا۔ جانے اُس نے اس عالم وارفتگی میں کس کس کو پکارا' کس کس کو آواز دی۔

"باجی ---- اماں ---- آپا ---- ماجد ----؟ ارے یہ سب کیا ہے؟ کس نے بنایا؟ کیوں بنایا ----؟"

"تجھے اچنبھا ہو رہا ہے؟" شاہدہ باجی کہیں قریب کھڑی تھیں۔

"احمقہ ----! یہ دربار ہے ---- درگاہ ہے۔"

یہ آواز ماجد کی تھی۔ تقدس کے جذبات نے اسے نیم بے ہوش کر رکھا تھا۔ اسے اپنے اردگرد کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

"دربار ہے ---- درگاہ ہے۔"

اس نے حیرت سے خود کلامی کی۔ مُنّی کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ خانقاہ کے منظر کو بڑھ کر چوم لے۔ اس پر حساسیت بھرے اپنے بازو پھیلا دے۔ عجب ترنگ کی لہریں اس کے بدن میں دوڑ رہی تھیں۔ وہ اس حیرت کدے کے زنغے سے نکل نہیں پا رہی تھی۔ یہ خوشی تھی یا غم ----؟ جس کی لپک اس کے اندر سے پھوٹ رہی تھی۔ کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی خاص کیفیت میں جکڑی گئی ہو۔ کبھی ہنسنے کو جی چاہتا تھا' کبھی رونے کو۔ وہ مکمل بے بسی کے عالم میں تھی۔ یہ کونسا تجربہ تھا کہ اس پر فسوں کی طرح طاری تھا۔

"یہ دربار ہے ----! دربار ہے ---- مگر" وہ بڑی مشکل میں تھی۔ سوال اس کی گرفت میں نہیں آ رہے تھے۔ اس کے اردگرد کھڑے افراد جواب لیے حاضر تھے کہ شاہدہ باجی نے اسی اتراہٹ سے کہا جو اس کا وطیرہ تھا۔

"پوچھو ---- پوچھو ---- عادت پوری کرو۔ بولتی کیوں بند ہو گئی۔"

مُنّی کو سوال کا سرا مل گیا۔ اس نے بدقت کہا:

"مزار ---- مقبرہ ---- مگر کس کا ----؟"

"سمجھ لو کہ پیر مکوڑے شاہ کا۔۔۔۔" یہ ماجد کی آواز تھی جسے اس نے آسانی سے پہچان لیا۔

"مکوڑے شاہ کا! مگر کیوں۔۔۔۔؟"

"بس ہے۔۔۔۔ مان لو۔" یہ بھی ماجد ہی کہہ رہا تھا۔

آپا اور باجی نماز مغرب ادا کرنے کے لیے جا چکی تھیں۔ تب ماجد اسے سرگوشی میں مطلع کرنے لگا۔

یہ مزار ہی ہے نا!۔۔۔۔ دیکھو کتنا نور برس رہا ہے۔ جانو آسمان سے فرشتے آئے ہوئے ہوں۔۔۔۔ ہیں نا۔۔۔۔ ایسا ہی دکھتا ہے نا۔۔۔۔؟"

منی چپ تھی۔

ننھے مزار کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے دیکھتے گویا اس کے اندر سے کئی سوالات کے جواب آپ ہی آپ ابھر رہے تھے۔ اس کی روح و قلب کی وساطت سے۔ وہ بے ہوشی اور نیم ہوشمندی کے درمیان ادب اور احترام کے رستے پر کسی مداری کے معمول کی طرح سفر کر رہی تھی۔ وجود معلق اور سفر دشوار۔ موت کی وادی سے واپسی کا سفر۔ کٹھن اور سانس سانس بھر دو بھر۔۔۔۔ مگر کتنا اٹل۔۔۔۔! کہ ابھی بہت سے سوال باقی تھے۔ بہت سے سوال اٹھنے کو تڑپ رہے تھے۔ عجب نشہ تھا کہ چھٹکارا بس میں نہ تھا۔

مکوڑے شاہ کے تعویز میں جلتے چوکھیے دیے کو تکتے تکتے اس نے خود کو باور کرانے کی کوشش کی۔

"سب کچھ میرے اندر ہے۔۔۔۔ سب کچھ میری نظر میں ہے۔۔۔۔ میں ہوں' میں ہوں۔۔۔۔"

منی بڑبڑا رہی تھی۔۔۔۔ اور زندہ تھی۔

OOOOO

چپڑی روٹی

سلمٰی نے مُنّی کو کئی باتوں سے منع کر رکھا تھا۔
مثلاً "اونچ اور نیچ کا فرق اللہ کی طرف سے ہے۔ اسے قبول کرنا چاہیئے۔"
"جب کھیت میں ہل چل رہا ہو تو اس کے آگے نہیں آنا چاہیئے۔"
"دیے باتی کے بعد ننگے پیر نہیں پھرنا چاہیئے۔"
"پرائی چپڑی روٹی دیکھ کر اپنا من للچانا نہیں چاہیے۔"
سلمٰی اس قسم کے اسباق مُنّی کے سامنے تقریباً ہر روز ہی دہراتی رہتی جو مُنّی کے چھوٹے معصوم ذہن میں ثبت تو ہوتے رہتے مگر ان کے معنی کیا ہیں؟ مُنّی کو ان پر غور کرنے کی فرصت کہاں تھی۔۔۔۔؟ ابھی وہ تین ہی برس کی تو تھی۔ اور جب سلمٰی نے اسے کریروں کے گھنے جال دار جھنڈ میں جانے سے روکا تو مُنّی سوال کیے بغیر نہ رہ سکی۔
"کہہ جو دیا نہیں جانا اس طرف۔"
"لیکن کیوں۔۔۔۔؟"
"وہاں بھوت ہوتے ہیں۔"
"بھوت ابا کو کیوں نہیں کھاتے۔۔۔۔؟"
"بھوت بڑوں کو نہیں کھاتے۔"
"وہ ترکھانوں کی شیداں کو کیوں نہیں کھاتے۔۔۔۔؟ اور تیلیوں کے بیٹے فرحان کو کیوں نہیں کھاتے؟ وہ ادھر روز روز جاتے ہیں۔ ہر وقت جاتے ہیں۔۔۔۔؟ میں بچّے پہ

کھڑی ہو کے دیکھتی ہوں۔ امی۔۔۔! وہ جاتے ہیں پھر شام۔۔۔ شبوتے واپس آ جاتے ہیں۔" مُنّی نے ایک روز ایک ہی سانس میں پورا مافی الضمیر بیان کر دیا۔

"وہ۔۔۔ وہ کیوں کے بچے ہیں نا۔۔۔! اس لیے سالم شبوتے واپس آ جاتے ہیں۔۔۔ انہیں بھوت کچھ نہیں کہتے۔۔۔" سلمیٰ وضاحت نہیں کر پا رہی تھی۔

"بھوت۔۔۔ شلف اچھے بچوں کو کھاتے ہیں۔۔۔؟" یہ مُنّی کی قیاس آرائی تھی۔

"ہاں۔۔۔ اچھے بچوں کو تھوڑا تھوڑا کر کے نہیں کھاتے۔۔۔ پورے کو نگل لیتے ہیں۔"

سلمیٰ کے جواب پر جب مُنّی سر سے پاؤں تک تھرا گئی تو سلمیٰ نے اسے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ اور بوسوں کی بوچھاڑ کر دی۔

ٹیوب ویل والی کوٹھڑی میں جانا بھی سختی سے منع تھا۔۔۔ مگر مُنّی تجربے کے طور پر گئی۔۔۔ اندر خاصا اندھیرا تھا اور انجن کی مسلسل گڑگڑاہٹ ہیبت ناک تھی۔ مُنّی آنکھیں پھاڑ کر دیکھتی رہی اس کی محویت مانوسیت میں بدلنے کو تھی کہ انجن چلتے چلتے ایک دھماکے سے رک گیا۔ "اوئی ماں" کہہ کر وہ دروازے کی طرف دوڑی' پاؤں دہلیز میں پھنسا اور وہ منہ کے بل گر گئی۔ اگلے دانت نچلے ہونٹ میں گڑ گئے۔۔۔ خون بہہ نکلا۔۔۔ خون نے مُنّی کو پریشان کر دیا۔ وہ فراک کے دامن سے ہونٹ کو دبائے ضبط کے ساتھ چپ چاپ جا کر باپ کے پاس کھڑی ہو گئی۔۔۔ اس کا باپ ابرار اپنی ہی دھن میں گدھے پر "آتھرپالانا" ڈال رہا تھا۔ اسے دو بوری اناج لے کر منڈی جانا تھا تاکہ گھر داری کی چیزیں خرید لائے باپ نے مُنّی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔۔۔

"کیا بات ہے۔۔۔؟"

"ابا۔۔۔ ابا۔۔۔ بھوت کو مار دو۔"

"اچھا ماریں گے۔۔۔"

"ابھی مارو۔"

"ماروں گا۔۔۔ ماروں گا۔"

"کش وت۔"

"آ کے ماروں گا۔۔۔" ابرار نے گدھے پر بوری لادتے ہوئے کہا۔ اب وہ دوسری

بوری لادنے کی کوشش میں تھا۔ اس نے منّی کو پچکارتے ہوئے کہا۔

"جا۔۔۔ میری بیٹی۔۔۔! میرے لیے پانی کا گلاس لا۔۔۔ چلنے سے پہلے پانی پی لینا چاہیے۔ میں تیرے لیے چوڑیاں لاؤں گا۔۔۔ لڈو اور ناگر لاؤں گا۔"

اور جب منّی لالچ دینے پر بھی وہیں کھڑی رہی تو ابرار نے ڈانٹا۔

"اے جا۔۔۔ جاتی کیوں نہیں۔۔۔؟ مجھے دیر ہو رہی ہے۔۔۔ مار کھائے گی مجھ سے۔"

تب منّی دوڑتی ہوئی احاطے کے صدر دروازے کو عبور کر گئی۔ اس وقت اسے درد' لہو اور بھوت کے بارے میں کچھ یاد نہ تھا۔ اور جب وہ مرغیوں کے دڑبے پر پڑی برتنوں کی ٹوکری میں سے گلاس نکالنے کی جدوجہد میں تھی تو برتن آپس میں ٹکرائے۔۔۔ شور سے جھولنے میں سویا منا بھائی "ای ہی' ای ہی" کرتا ٹھنٹھنانے لگا تو سلمٰی غصے سے چلائی۔۔۔ وہ گوبر اور مٹی کو گوندھ رہی تھی اس وقت۔ لپائی کے دن وہ اعصابی ہوتی۔

"جگا دیا۔۔۔ جگا دیا؟ منّی۔۔۔ تجھے عقل کب آئے گی۔۔۔؟ دیکھ۔۔۔ جھولا دے بھائی کو۔۔۔ آرام سے۔۔۔"

منّی دڑبے کے پٹ پر پاؤں رکھ کر عجلت سے نیچے اتری۔ چارپائی سے بندھی کپڑے کی جھلانی کو دو چار ہاتھ مارے۔۔۔ پھر گلاس نلکے کی دھار کے نیچے رکھا اور لٹک لٹک کر ہتھی کو چلایا۔۔۔ پانی تو آگیا مگر دھار کبھی ادھر گرتی تھی اور کبھی ادھر' بڑی مصیبت تھی۔۔۔ جلدی بھی تھی۔۔۔ باپ احاطے سے باہر کھڑا پکار رہا تھا۔۔۔

"منّی۔۔۔ اے منّیاں۔۔۔ کہاں مر گئی۔۔۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ دھوپ چڑھ دے گی تو مجھ کو۔"

اب وہ اور زیادہ تیزی پیدا کرتے ہوئے ہتھی پر اچھلی' کودی' جھولی۔۔۔ گلاس بھر گیا تو دونوں ہاتھوں سے تھام کر باہر دوڑ گئی۔ تمام احتیاط کے باوجود گلاس بھرا ہوا باپ تک نہ پہنچ سکا۔۔۔ تاہم ابرار نے پکڑتے ہی غٹاغٹ پی لیا۔ منّی کو یہ کام انجام دے کے بہت خوشی ہوئی۔

"بہت۔۔۔ تیرے کی۔۔۔ گھڑے کا پانی نہیں لائی۔۔۔!" اس پر منّی اپنے زخمی ہونٹ کے ساتھ مسکرا دی۔۔۔ باپ کو اس بات کا بھی دھیان نہ تھا کہ گھڑا تو گھڑونچی پر

پڑا ہے اور گھڑونچی مُنّی کے قد سے اونچی ہے۔
"اچھا۔۔۔ تو اب اندر جا۔۔۔ اِدھر اُدھر مت گھومنا۔۔۔"
ابرار نے گلاس مُنّی کو تھما دیا اور خود احاطے کی دیوار پر سے بیوی کو بتایا۔
"میں چلتا ہوں۔۔۔ بچوں اور باہر کا خیال رکھنا۔۔۔ دن ڈھلے لوٹوں گا۔۔۔"
وہ پگڈنڈی پر گدھے کو ہانکتا نپے تلے قدموں سے چل رہا تھا۔ مُنّی احاطے کے صدر دروازے کی دہلیز پر کھڑی باپ کو جاتے ہوئے محویت سے دیکھتی رہی۔۔۔ گدھے اور ابا نے آگے پیچھے چلتے ہوئے کھالا عبور کر لیا۔۔۔ اب وہ پھر رواں تھے۔۔۔ چلتے چلتے کریروں کے جھنڈ کے پیچھے جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ شہر جانے والے سبھی مسافر کریروں کے پیچھے جا کر غائب ہو جاتے تھے۔
مُنّی کو اس طرح کھڑے ہو کر لوگوں کو آتے جاتے دیکھنا بہت اچھا لگتا تھا۔ کریروں کے پیچھے غائب ہونا تو اور بھی سنسنی خیزی رکھتا تھا۔ وہاں کوئی عالم الغائب تھا۔ جس کی طرف جانے کی مُنّی کو ابھی اجازت نہ تھی۔ کیونکہ ابھی وہ صرف تین ہی برس کی تو تھی۔ اس کے لیے یہ کوئی ماورائی جگہ تھی۔ جس تک اس کی عقل اور عمر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ جہاں جانے کے لیے قد ذرا بڑا ہونا چاہئے۔ گھڑے میں سے پانی لینے کے لیے بھی قد بڑا ہونا چاہئے۔ اور ٹیوب ویل کی کوٹھڑی میں جانے کے لیے بھی آدمی کو بڑا ہونا چاہیے۔ ورنہ بھوت دھکا دے دیتا ہے۔
گھر کے چھوٹے موٹے کام سرانجام دینے کی کوشش میں مُنّی کو بار بار چتا ہوئی کاش! وہ جلدی سے بڑی ہو جائے۔ ابا جتنی لمبی نہ سہی' ماں جتنی اونچی تو ہو ہی جائے۔ پھر کچھ بھی مشکل نہیں رہے گا۔ کوئی بھوت نہیں ڈرا سکے گا اسے۔ اور کریروں کے جھنڈ کے اس پار تو اسے جانا ہی ہے۔۔۔ ایک دم بڑے ہونا اس کے بس میں نہیں تھا۔ تاہم ہر شے تک رسائی کی کوشش وہ مقدور بھر کرتی رہتی۔
آج دوپہر جب سلمٰی تنور میں تھپا تھپ جیتی روٹیاں لگا رہی تھی مُنّی نے چنگیر میں سے گرم گرم روٹی اٹھا کر دانتوں سے توڑی تو تڑپ اٹھی۔ نمک مرچ اور گرم روٹی نے اس کے ہونٹ کے زخم کو ادھیڑ دیا۔ وہ بلبلا کر رہ گئی۔۔۔
"کیا ہوا۔۔۔؟ مُنّی کیا ہوا؟ واری جاؤں۔"

"کھون نکل آیا ای----!" اور تب کام سے ہاتھ روک کر سلمیٰ نے بیٹی کی طرف توجہ دی۔ گہرے سبز رنگ کی میلی کچیٹ فراک کے دامن پر جگہ جگہ لہو کے دھبے سوکھ چکے تھے۔ سلمیٰ نے اپنی لاعلمی پر خود سے خفا ہوتے ہوئے بیٹی کو دشنام کیا-----

"پتا نہیں----- کہاں کہاں گرتی پڑتی ہے----- کہاں گری تھی-----؟"

سلمیٰ نے منّی کو سینے سے لگالیا۔ ممتا کے چشمے سے نمی اُٹھ کر آنکھوں میں آ گئی۔ اُدھر تنور میں لگی کسی روٹی سے جلنے کی بو آنے لگی----- سلمیٰ گھرداری اور نوع بنوع کاموں میں جتی ممتا کے اظہار کی عیاشی کرنے کی متحمل نہیں تھی۔

"دیکھ----- پرے ہٹ----- کوئی روٹی جل رہی ہے۔" اس نے منّی کو الگ کردیا۔ "بتا چوٹ کیسے لگی-----" روٹیاں تنور میں سے نکالتے ہوئے سلمیٰ نے پھر پوچھا-----

"بھوتوں والی کوٹھڑی سے-----"

"تجھے میں نے منع نہیں کیا تھا----- مگر تو سنتی تھوڑی ہے-----؟" اب سلمیٰ بڑبڑاتے ہوئے سمجھا رہی تھی-----

"منّی! پتا نہیں تو کب سیانی ہو گی----- کب اپنے دماغ سے سوچے گی-----؟ تو نہ کام کی نہ کاج کی۔ اچھا' جا----- جا کے بھائی کی جھلانی کو ہلا جا کے----- کوئی بات نہیں----- اچھے بچے ذرا سی چوٹ پر روتے نہیں۔"

منّی بلا شکوہ شکایت بھائی کی جھلانی ہلانے چلی گئی----- اچھی بچی منّی کو پھر ایک بے محل چھتانے آ لیا----- کاش وہ جلدی سے بڑی ہو جائے اور اپنے دماغ سے سوچنے لگے----- اپنے دماغ سے سوچنے میں ہی عافیت ہے-----

گاؤں کے غریب لوگوں کی مادری محبت اور پدرانہ شفقت بے حد جبلی ہوتی ہے۔ اولاد نہ ہو تو اس کے ہونے کی خواہش میں سرگرداں ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ جائز ناجائز کی حدود کا تعین بھی نہیں دیکھتے۔ نہیں ہے----- کیوں نہیں ہے؟ کیوں-----! پر اپنے انداز سے غور کرتے ہیں۔ سارا زور اور دھیان "ہونے" پر خرچ کرتے ہیں۔ اور جب اولاد ہو جائے تو اسے لپ جھپ پلنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔

بیاہ ہونے کے ساتھ ہی جب سلمیٰ کا پاؤں بھاری نہ ہوا تو اس جوڑے کے ماں باپ اور

ساس سسر نے کوئی درگاہ' کوئی وید حکیم اور عامل نہ چھوڑا جس سے دوا اور تعویز نہ لیا ہو۔۔۔۔۔ مُنی کی دادی تو پوتے پوتی کو گودی میں کھلانے کی حسرت لیے مر گئی۔۔۔۔۔ پانچ سال گزر گئے' بہت منتوں مرادوں کے بعد اللہ نے مُنی دی تو دادے کو زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔۔۔۔۔ وہ پہلوٹھی کا لڑکا چاہتا تھا۔۔۔۔ تاکہ آئندہ نسل کی جیتے جی نیو دیکھ لے۔۔۔۔۔ پر جو اوپر والے کو منظور۔۔۔۔۔

اب کے سردیوں میں دادا بھی اللہ کو پیارا ہوا۔۔۔۔۔ اچھا بھلا تھا۔۔۔۔۔ دونوں باپ بیٹا اپنی اراضی کو ٹھیک ٹھاک سنبھال لیتے تھے۔۔۔۔۔ مزارعوں کے چلے جانے کی کمی زیادہ محسوس نہ ہوئی۔۔۔۔ کام کی زیادتی ہوئی تو کوئی عارضی نوکر پکڑ لیا۔۔۔۔۔ دادا کے مرنے کے بعد بڑی تنگی ہو گئی تھی۔ کام میں بھی اور مجموعی ساکھ میں بھی نمایاں تبدیلی واقع ہو گئی۔ اب گاؤں کے کمی اور مزارعین ابرار کو آنکھیں دکھاتے' پروا نہ کرتے۔۔۔۔ ذرا ذرا سی بات پر بدکتے کاٹنے کو دوڑتے۔

مُنی اپنے والدین کی چہیتی تھی۔ تبھی وہ مُنی کو درزی کی سلی ہوئی فراک اور پاؤں میں جوتا پہناتے تھے اگرچہ اتنی استطاعت نہ تھی۔ اس کے مقابلے میں "بھینی" کے دوسرے بچے آدھے ننگے آدھے ڈھکے' ننگے پاؤں گلیوں اور کھیتوں میں لوٹ پوٹ ہوتے رہتے۔ مُنی کو ایسی پست حرکتوں کی اجازت نہ تھی کیونکہ وہ "بھینی" کے اس خاندان کی لاڈلی بچی تھی جو کبھی دینے والا ہاتھ رکھتے تھے۔ عزت دار کہلاتے تھے۔ گندے' عام بچوں سے کھیلنے کی بھی سختی سے ممانعت تھی۔ مفلسی تھی مگر تھے وہ رانجھ۔ ابرار خان کلف دار سفید پگڑی اب بھی پہنتا تھا اور اس کو وہ اپنی پہچان خیال کرتا تھا جو پرکھوں سے چلی آ رہی تھی۔۔۔۔

جب سے شہروں میں صنعتیں قائم ہونے لگی تھیں۔ اچھی اُجرتوں کی کشش نے کھیت مزدوروں کو نقل مکانی کر کے شہروں کی طرف کھینچ لیا تھا۔ گاؤں کے ہنرمند۔۔۔۔ لوہار' ترکھان' کمھار' تیلی' جولاہے' مراثی' اور عام کھیت مزدور کھیتوں سے صدیوں پرانے ناتے توڑ کر دوڑ رہے تھے۔ بہت سے ہوائی جہازوں کے ذریعے اجنبی سرزمینوں کا رخ کر چکے تھے۔ ان حالات میں تھوڑی کھیتی باڑی جاری رکھنا کافی مشکل تھا۔ کارندوں کے دماغ ساتویں آسمان پر تھے۔ اتنی اونچائی سے ابرار کی طرف تعاون کا ہاتھ کون بڑھاتا۔

مُنّی کی دو پھوپھیاں ایک ایک کر کے شہروں میں جا بسیں۔ ان کے شوہر سرکاری دفتروں میں ملازم تھے۔ اچھی خاصی کایا کلپ ہو چکی تھی ان کی۔ وہ بھائی کی بہتری کے لیے اکثر تنبیہہ کرتیں۔

"بارِی! چھوڑو یہ پشوؤں والی زندگی۔ شہر آ جا۔۔۔۔ کوئی ہٹی وٹی ڈال لے۔ ادھر سے چیزیں لے ادھر بیچ۔ ساری دنیا یہی کر رہی ہے۔ نفع کما رہی ہے۔ ادھر کا مال اُدھر اور اُدھر کا مال اِدھر۔۔۔۔ پر تو زمین سے چمٹا کیا حاصل کر رہا ہے۔ کچھ نہیں رکھا اس میں۔" ایسے موقعوں پر سلمٰی بھی نندوں کی ہم نوا ہو جاتی۔۔۔۔

"باجی۔۔۔۔ سیدھا ہے تمہارا بھائی۔۔۔۔ ہمارے کالے شہروں میں جا کر سینٹھ ہو گئے۔ اسے زمین سے ہی ملے گا جو ملے گا۔ بہت پیار ہے اس اماں سے۔۔۔۔"

یہ حقیقت ہے کہ ابرار کو اپنے کھیتوں اپنے پشوؤں اور کھیتوں کے کنارے اگے ہوئے شیشموں' جامنوں اور بیریوں سے بہت پیار تھا۔ ان میں سے بہت سے اس کے ساتھ ساتھ بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔ کتنے عزیز تھے یہ سب۔ کبھی خزاں کے زمانے میں ان کی چھانٹی کرنی پڑتی تو اسے دکھ ہوتا۔۔۔۔ یوں لگتا جیسے وہ چیخ چیخ کر کہتے ہوں۔۔۔۔

"یار۔۔۔۔! ہاتھ ہولا رکھ۔۔۔۔ درد ہوتا ہے۔"

اس کی کی ہوئی چھنگائی اس کے باپ کو کبھی پسند نہ آئی۔ شہر منتقل ہونے کے لیے بہنوں کے اصرار کو نظرانداز کرتے ہوئے وہ صاف کہہ دیتا۔۔۔۔

"آپا! یہاں مجھے چار لوگ جانتے ہیں۔ شہر میں جا کر میں کھو نہ جاؤں گا؟ اور کسی نے تو ان کھیتوں کو بسائے رکھنا ہے۔ ایک ہجرت کافی ہے۔"

"ہمیں کیوں۔۔۔۔؟" سلمٰی سوال کرتی۔۔۔۔

"ہمیں کیوں نہیں۔ ہم پکھی واس نہیں کہ روز ٹھکانے بدلتے رہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ان شاء اللہ۔" نقل مکانی کا موضوع اکثر زیرِ بحث آتا۔ لیکن بیل منڈھے نہ چڑھتی۔

گھر اور باہر کے تمام کام ابرار کو خود کرنے پڑتے۔ سلمٰی جو بنیادی طور پر قصباتی لڑکی تھی' شوہر کی اطاعت میں بالکل دیہاتن بن چکی تھی۔ ہروقت کی جسمانی مشقت میں سر پیر کا ہوش نہ تھا۔ بچوں کے چونچلے اٹھانے کی فرصت کہاں۔ مُنّی کبھی ماں کا ہاتھ بٹاتی اور

کبھی باپ کا۔۔۔۔ وہ زمین کے ساتھ لگی لگی بتیرے کام نمٹا لیتی۔ بالکل غیر محسوس طور پر۔۔۔۔ اس کی کارکردگی کہیں ریکارڈ پر نہ تھی۔۔۔۔

شاید ستمبر کا مہینہ تھا۔۔۔۔ فضا میں خاصی تمازت اور گھٹن تھی۔ دوپہر کا وقت تھا' ابھی آدھے بگھیے کی گوڈی ہوئی تھی۔ کپاس کے ننھے ننھے پودوں پر کونپلیں پتوں کی شکل اختیار کر چکی تھیں۔۔۔۔ کھیت میں سے فالتو جڑی بوٹی نکالنا بھی اتنا ہی ضروری تھا جتنا کہ فصل بونا اور پانی دینا۔ منی باپ کا ہاتھ بٹانے کی کوشش میں تھی کہ پگڈنڈی پر سے جیلے تیلی کا لڑکا برہان ٹرانسسٹر بجاتا اکڑ دکھاتا گزرا۔۔۔۔ ابرار نے کوئی توجہ نہ دی اپنے کام میں جتا رہا۔۔۔ جیلے تیلی کے بزرگ پشتوں سے ان کے مزارعے چلے آتے تھے۔۔۔۔ ادھر تین چار برس میں یہ لوگ دھڑا دھڑ عرب ریاستوں کو جانے لگے تو گاؤں کے ماحول میں ایک اتھل پتھل سی رہنے لگی۔ ابرار کو یاد آتا تھا کہ ایک نیچے کی اوپر اور اوپر کی نیچے تب ہوئی تھی جب پاکستان بنا تھا۔۔۔۔ دوسری اب ہو رہی ہے۔۔۔۔ دیکھو۔۔۔۔ کیا ہو۔۔۔۔!

پشتی مزارعے اس کے سامنے اکڑ اترا کر گزرتے تو ابرار کا خون کھول اٹھتا اور آج تو حد ہو گئی۔ برہان نے قریب سے گزرتے گزرتے جان بوجھ کر کیسٹ پلیئر کا ساؤنڈ والیوم اونچا کر دیا' پاکستان کی مقبول مغنیہ گا رہی تھی "اکھ لڑی تے لڑائی جا چپ کر کے" پھر آنکھ میچ کر ابرار کو نچکری۔

"چاچا۔۔۔۔ فیر کیسا آ۔"

"واہیات۔۔۔۔" ابرار نے برہان کی آنکھوں میں دل کی ساری نفرت انڈیلتے ہوئے جھانکا۔۔۔ "اصل میں ہر شے اپنے اصل کی طرف لوٹ جاتی ہے"

"میرے اصل کی بات کرتے ہو۔۔۔۔ تیری چھوکری۔۔۔۔"

برہان نے پاس کھڑی منی کی طرف اشارہ کر کے اتنی غلیظ گالی دی کہ ابرار کے لیے غصے پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا۔ وہ رمبا وہیں چھوڑ کر برہان پر جھپٹا۔ برہان نوخیز چھوکرا تھا۔۔۔۔ وار بچا کر ابرار پر پل پڑا۔

"تیری یہ ہمت بڈھے۔۔۔۔" برہان نے گھونسوں اور گالیوں کی بارش کر دی اور پھر ٹانگوں میں اڑنگی دے کر ابرار کو چت کر دیا۔ منی چلا چلا کر روتی باپ پر گر گئی۔ ابرار خود

کو سنبھال کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ٹانگوں سے لپٹ گئی۔
"میرا ابا ہائے میرا ابا" اس سے باپ کی بے بسی دیکھی نہ جاتی تھی۔ ابرار نے برہان کا کیسٹ پلیئر اٹھایا اور کھال میں پھینک دیا۔ اب کیا تھا برہان کو آگ لگ گئی۔ اس نے ابرار کو ایک بار پھر زمین پر دے مارا اور اس کے سینے پر بیٹھ گیا۔۔۔۔
"ارے۔۔۔۔ تم لوگ ہو ہی کیا۔۔۔۔؟ ہمارے پچھلے پاگل تھے جو اُدھر بھی تم لوگوں کی غلامی کرتے تھے اور یہاں بھی۔ اب دیکھتا ہوں تم کیسے خار کھاتے ہو ہم سے۔۔۔۔ تمھاری۔۔۔۔ بکی۔۔۔۔ تمھاری بہن۔۔۔۔" وہ اور ابرار باہم ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔۔۔۔ برہان نے ابرار کی گردن دبوچ رکھی تھی۔ وہ حاوی تھا۔ اس نے پوری طاقت سے دشمن کو زمین میں دھنسا رکھا تھا۔ لڑائی کی گھمسان اور منی کی چیخ پکار سن کر آس پاس کے لوگ دوڑے آئے اور انھیں چھڑا دیا۔ ان لوگوں میں زیادہ تعداد برہان کے حامیوں کی تھی۔ وہ سب اسی کی قبیل کے تھے۔
دیہی زندگی میں بڑی تیزی سے جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ ان کا سب سے اہم پہلو باہمی تعلقات میں کشیدگی تھی۔۔۔۔ صدیوں پرانی قدریں ہیئت بدل رہی تھیں۔ جن کا اثر روزمرہ کے کاروبار حیات پر پڑنا لازمی تھا۔ مجموعی معیشت متاثر ہو رہی تھی۔ وہ ہاتھ جو زرعی پیداوار میں معاونت کرتے تھے' پرداخت میں اپنا حصہ ڈال کر برداشت میں سے حصہ لیتے تھے' پرداخت کے وقت غیر حاضر تھے۔ مگر برداشت کو صرف کرنے کے لیے ان کے وسائل بہت بڑھ گئے تھے۔ وہ روپیہ خرچ کر کے ہر چیز خرید سکتے تھے۔ ہر نعمت آہستہ آہستہ ان کی دسترس میں آ رہی تھی۔ وقت تیزی سے بدل رہا تھا۔ باہمی رشتوں کے دھاگے کمزور پڑتے جاتے تھے' قطعی ناقابل اعتبار تھے۔
ابرار کے سیدھے سادے ذہن میں بس اتنی سی بات آتی تھی اور وہ اسے دوسروں کو باور کرانے پر مصر تھا:
"ہر گھر سے اخلاق کا جنازہ نکل رہا ہے۔ جسے کندھا دینے والا کوئی نہیں بچا' اب بستیوں میں وبائی امراض نہیں پھیلتے۔ اخلاقی امراض وبائی شکل میں پھیلتے ہیں۔۔۔۔" یہ اس کے اندر ہونے والی جنگ کی گھن گرج تھی یا وہ اتنا سیانا ہو گیا تھا۔۔۔۔
اس کی اپنے پرانے مزارعوں کے ساتھ کئی جھڑپیں ہوئیں۔ ہر بار پنچایت یا پولیس نے

بیچ بچاؤ کرا دیا۔ ابرار پر دباؤ زیادہ رہتا۔۔۔۔ کیونکہ اس کے پاس کیش نہیں ہوتا تھا۔۔۔ اکثر یہی مشورہ دیتے۔۔۔۔

"بھئی جو دو چار کلے ہیں بیچو۔۔۔۔ اکیلے آدمی ہو۔۔۔۔ کہاں تک لڑو گے۔۔۔۔"

اب اس کے مزارے اس کی اراضی پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ قانون حق شفع کے تحت ابرار کی زمین پر ان کا حق فائق تھا۔ ابرار انہیں اس قانون سے فیضیاب کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ سوچنا تک نہ چاہتا تھا۔

ان کی "بھینی" کی بودوباش میں روز بروز زمین آسمان کا فرق آتا جا رہا تھا۔ اس کی مُنی لڑکپن سے جوانی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بیٹے کو تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے چھوٹی پھوپھی کے پاس بھیج دیا تھا۔۔۔۔ مُنی کو اب احاطے سے باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ ابرار کا خیال تھا کہ برس چھ ماہ میں وہ اس کے ہاتھ پیلے کر دے گا۔۔۔۔ بس بڑی بہن کے بیٹے کی نوکری لگنے کی دیر تھی۔ لڑکا چار حرف پڑھ گیا تو ٹھیک' نہیں تو پھر کھیتوں میں ہاتھ تو بٹائے گا ہی۔

جیلے تیلی کی حویلی اب منزل منزل اونچی ہوتی جاتی تھی۔ ان منازل میں اس کے بیٹے اور بہوؤں کے مسکن تھے۔ جو سال دو سال بعد آ کے ان منزلوں کو آباد کرتے۔۔۔۔ اب ابرار کے گھر کا پردہ' دھوپ اور سایہ جیلے تیلی کی حویلی کے کنٹرول میں تھا۔ اس کی بیٹیاں بہوئیں' پوتیاں اور نواسیاں چوبیس گھنٹے گہرا میک اپ کیے رنگین ریشمی آنچل لہراتی' حویلی کی چھتوں اور منڈیروں پر جلوہ افروز ہوتیں تو ابرار بیٹی کو کوٹھڑی میں چلے جانے کا مشورہ دیتا۔۔۔۔ لیکن مُنی جب ان نظاروں سے آنکھیں چرا لیتی تو اس کا ہر مسام کان بن جاتا۔۔۔۔ جیلے کے ہاں چلتے کیسٹ پلیئر یا وی سی آر پر چلتے فلم کے گیت اس کے وجود میں رس گھولتے۔۔۔۔ اپنی طرف کھینچتے۔۔۔۔ ان میں سے بہت سے گیت مع دھن کے اسے یاد ہو گئے۔۔۔۔ عمر کے میٹھے برس لگ چکنے کا اسے احساس نہیں تھا۔ مگر اس پر موسیقی اور شاعری اپنے بھید منکشف کرتی اسے مبہوت کیے رہتی۔۔۔۔

"جدوں ہولی جہی لیندا میرا ناں۔۔۔۔ میں تھاں مر جانی آں وے۔ میں تھاں مر جانی آں۔۔۔۔ ہائے۔۔۔۔ ہائے جدوں۔۔۔۔"

وہ خود بخود گنگنا اٹھتی۔۔۔۔ سلمیٰ نے اس کی شکایت ابرار سے کی تو اس نے بیٹی کو

سمجھانا اپنا فرض سمجھا----

"نہ بیٹی----! لچر گیت گانا---- کنجریوں کا کام ہے۔ تم تو خود سیانی لڑکی ہو---- جب گیت گانے کو جی چاہے تو تم قرآن کھول لیا کرو۔ اس میں ہدایت ہی ہدایت ہے۔"

منّی اب سوال نہیں پوچھتی تھی---- بلکہ سوالیہ نظروں سے باپ کے چہرے کی طرف تکتے رہنا بھی ترک کر دیا تھا اس نے---- البتہ ماں سے بہت سی باتیں پوچھنا اور بار بار پوچھنا اسے اچھا لگتا تھا----

"امی---- پیار کیا ہوتا ہے----؟"

"جیسے تمہیں مجھ سے پیار ہے' اپنے بھائی سے ہے۔" سلمیٰ جواب دیتی۔

"نہیں---- ایک پیار اور بھی ہوتا ہے----"

"اور----؟ اور کونسا----؟" سلمیٰ خاصی گوڑ تھی۔

"ہوتا ہے امی---- تمہیں نہیں پتا----" منّی کریدتی۔

"اچھا----؟ اچھا----؟ یہ تیلیوں کے ریڈوو نے تمہارا دماغ ہلا دیا ہے۔ وہ---- وہ پیار---- تمہیں اپنے منگیتر شفیق سے ہونا چاہیئے' لڑکی۔"

منّی ہیر پھیر کر ایسے سوالات کرتی رہتی جن کا جواب کافی جمع تفریق اور ضرب اور تقسیم کے بعد ہی نکلتا---- "تمہیں صرف اپنے منگیتر سے پیار کرنا چاہیئے بس"

رفتہ رفتہ منّی نے سوال کرنا چھوڑ دیا۔ اس سوال کو دہرانے کا کیا فائدہ جس کا جواب مرضی کے مطابق مطمئن نہ کرے----؟

بہار کے دن تھے---- فضا میں گرمی اور خنکی مکمل مل چکی تھی۔ درخت اپنے پرانے بانے بدل چکے تھے---- ابرار کسی کام سے شہر گیا تھا۔ شاید منّی کے بیاہ کی بات پکی کرنے---- رات کو دیر سے واپسی ہوئی---- سلمیٰ دروازہ کھولنے کے بعد یکدم اس سے لپٹ گئی۔ پھس پھس کر کے روتی سلمیٰ کو ابرار نے تسلی دینے سے پہلے خود سے الگ کر دیا اور کوٹھڑی میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔

"کیا بات ہے----؟ منّی کہاں ہے----؟" جانے کیوں اس کے دل میں وہم سا آیا---- سلمیٰ کی ہچکی نے چغلی کھائی---- تو وہ گھبرا گیا۔

"میں پوچھتا ہوں کہاں ہے مُنّی----؟" وہ سر سے پیر تک کانپتے ہوئے بولا----

"پتا نہیں----" وہ پھر رونے لگی---- "ہائے ہائے" وہ چارپائی پر اوندھی پڑی بلبلاتی رہی۔

"تم گھر میں ہو---- اور تمہیں پتا نہیں---- گدھی کہیں کی----" ابرار نے سلمٰی کو بالوں سے پکڑ کر دو چار جھٹکے دیئے۔

"میں تو خود ڈھونڈنے نکلی تھی---- کہیں نہیں ملی---- رستے میں اس کی دائی ملی تھی۔ مُنّی کا پوچھنے لگی---- میں نے کہا---- باپ کے ساتھ شہر گئی ہے پھوپھی سے ملنے---- بس اور کچھ نہیں بتایا---- مجھے معاف کر دو---- اللہ کے واسطے مجھے الزام نہ دو۔"

"زندگی میں پہلی بار عقل کی بات کی تو نے سلمٰی----!" وہ سر پکڑ کر کتنی دیر بڑبڑاتا رہا۔

اگلے چند دنوں میں وہ بیوی سمیت شہر منتقل ہو گیا---- اس کا خیال غالباً یہ تھا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی ہو گی۔ پھر کئی ماہ بعد اطلاع ملی کہ مُنّی جیلے تیلی کے چھوٹے بیٹے غفران کے ساتھ کویت میں ہے---- اس نے عمرہ بھی کر لیا ہے---- بہت خوش ہے---- کسی کو یاد نہیں کرتی----

(☆ بھینی : چھوٹا گاؤں)

OOOOO

خاتونِ آخر

میری حیثیت ہی کیا ہے؟ ایک سرکاری دفتر میں معمولی کلرک ہوں۔ کچھ کرنے نہ کرنے پر میرا کوئی اختیار نہیں۔ میں جو کچھ سوچ سکتا ہوں کر نہیں سکتا اور جو کچھ کرتا ہوں وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کرتا ہوں۔ مثلاً پچھلے ہفتے کسی شخص کی فائل اپنے سیل سے نکلوانے کے میں نے مبلغ بیس روپے لے لیے۔ میں چاہتا تو دو سو بھی لے سکتا تھا کیوں کہ اس شخص کی فائل کو میرے دفتر میں اٹکے ہوئے تقریباً چھ ماہ گزر چکے تھے۔ میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو اس کام کے کم از کم۔۔۔۔! نہ معلوم لینے والے کتنا کتنا لے لیتے ہیں۔ لے لے کے محل بنا لیتے ہیں اور محل کے ماتھے پر لکھ دیتے ہیں۔

"ہٰذا من فضل ربی"

اللہ اللہ خیر سلا۔ وہ رحیم کریم ہے بخشن ہار ہے۔ قادر ہے۔ سب کے باہر اندر کا حال جانتا ہے۔

میں جانتا ہوں مجھے بیس روپے نہیں لینے چاہئیں تھے۔ لیتا تو کم از کم دو سو لیتا۔ بیس روپے میں تو فقط ایک وقت کی ہانڈی پک سکی۔ ہوا یوں کہ بیوی نے کہا آج گوشت پکا لیتے ہیں۔ میں نے کہا اچھا چلو، پکا لیتے ہیں۔ نامعلوم اسے کیسے پتہ چل گیا کہ میری جیب میں آج فالتو پیسے ہیں۔ میرے خیال میں بعض بیویوں کی آنکھوں میں خودکار ایکسرے پلانٹ فٹ ہوتا ہے۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔؟ خیر۔۔۔۔

وہ اپنے ہفتہ وار راؤنڈ پر آئی تھی۔ ہاتھ میں بال پوائنٹ کا مٹھا پکڑے۔ بازو پر پلاسٹک کا تھیلا لٹکائے' دفتر کی تمام میزوں پر باری باری رکتی وہ جب بھی میری میز کے قریب آتی تو میں اس کے خاکستری چہرے پر ایک بھرپور نگاہ ڈال کر سر کی جنبش سے انکار کر دیتا۔ میں اس قسم کی فضول خرچی کا متحمل نہیں ہو سکتا کہ محض صنف نازک سے ہم کلام ہونے کے لیے ڈیڑھ دو روپے ضائع کروں۔

ہم کلرکوں نے اس کا نام بھنبھیری رکھا ہوا ہے۔ ان دنوں اس کے بدن پر لپٹی نائلون کی پھول دار ساڑھی ٹخنوں سے خاصی اونچی ہے اس کے پاس دو ہی تو ساڑھیاں ہیں۔ ایک نیلی اور دوسری پھولدار۔ دونوں ہی اس کی آبنوسی سوکھی ٹانگوں کو ڈھانپ نہیں سکتیں۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ نائلون کا کپڑا سکڑتا نہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ بھنبھیری کی عمر بڑھوتری کی نہیں۔

عورت ذات خواہ کوئی ہو' کہیں ہو' کسی بھی حال میں ہو۔ ہم مرد لوگ اس کے بارے میں مشوش ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جہاں صنف نازک سامنے آئی نظریں طواف کرنے لگیں۔ سینے کا ابھار کتنا ہے؟ کولھوں پر کتنی چربی ہوگی؟ چہرے پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد ہم لوگ جسم کے نشیب و فراز میں ڈوبنے ابھرنے لگتے ہیں۔ چہرے کو بس ہم Exit,Admit کے بورڈ کے طور پر پڑھتے ہیں۔ اس پر ہمیں Admit لکھا ہوا نہ بھی نظر آئے تو بھی Admit کے کئی راستے ہیں۔ نظروں کو کون روک سکتا ہے۔ یہ رینگتی رینگتی راستہ ڈھونڈ لیتی ہیں۔

میں نے دیکھا ہے بلکہ یوں کہوں کہ یہ میرا تجربہ ہے کہ بعض عورتوں کے چہرے پر جلی حروف میں لکھا ہوتا ہے۔

"No admission"

لیکن بعض برقعے سے خوب ڈھکی ہوئی Admit , Admit کی چال چلتی ہیں۔

ہاں تو بات بھنبھیری کی ہو رہی تھی۔ خاکستری چہرے والی۔ کوئلے کی کانوں جیسی دو بڑی بڑی آنکھیں باہم جڑی ہوئیں۔ شاید کاجل ہی اس کا واحد سنگار ہے۔ کبھی کبھی گلے میں پان کا بیڑا بھی ہوتا ہے۔ پان کی لال پیک دائیں باچھ کو چیرتی ہوئی سی دور نکل رہی ہوتی ہے۔

پان کھانے کے پیچھے طبیبوں اور شوقینوں کا کوئی بھی فلسفہ یا منطق کارفرما ہو ایک بات تو میں بھی ضرور کہہ سکتا ہوں کہ پان خور انسان خواہ کتنا ہی گندہ اور بدبودار ہو' اس کے منہ سے خوشبو ہی آتی ہے---- میری بیوی پائیوریا کی پرانی مریضہ ہے میرا کتنا جی چاہتا ہے کہ وہ باقاعدہ پان خور ہو جائے مگر جیب خالی ہو تو سارے دھیان اور مزے دھرے رہ جاتے ہیں۔

میں بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ بھبیری کی عمر میدان کی سی ہے۔ نہ کوئی چڑھائی نہ اترائی۔ وہ میری میز پر سرسری سا رکتی ہے مگر رکتی ضرور ہے۔ بال پوائنٹ کا مٹھا آگے بڑھا کر' آنکھوں میں سوال سجا کر---- بعض اوقات ایسے لگتا ہے جیسے پھولوں کا گلدستہ دکھا رہی ہو۔ اس کے چہرے پر Exit اور admit نہیں' دوسرا بہت کچھ ہے۔ پاؤں میں ہوائی چپلوں کے ساتھ ہزاروں میلوں کا چکر بندھا ہے---- سوختہ مہاگنی کی ٹہنیوں جیسے پاؤں---- کہتے ہیں مہاگنی کو کوئی روگ نہیں لگتا۔ گھن نہ دیمک---- بھبیری کے پاؤں ہزاروں میلوں کی مسافت طے کر چکنے کے بعد بھی بے داغ ہیں اور ابھی اور بہت سفر کر سکتے ہیں کیوں کہ بھبیری ابھی تک ہجرت میں ہے---- اسی لیے تو ہم نے اس کا نام بھبیری رکھا ہے---- قدرت نے اسے گھومتے رہنے کے لیے پیدا کیا ہے۔

میرا دوست خلیل فلسطینیوں کی ہجرت پر بہت دکھی رہتا ہے۔ کچھ سیاسی ذہن کا آدمی ہے۔ معاملات عالم کی خبر رکھتا ہے۔ اس کا جنرل نالج بہت اچھا ہے۔ دنیا بھر کے واقعات اسے یاد رہتے ہیں۔ شہر کی اچھی لائبریریوں میں جاتا ہے۔ مطالعے کا جنون ہے۔ باتیں اتنی وزن دار کرتا ہے کہ بعض تو ہم لوگوں سے اٹھائے نہیں اٹھتیں۔ گریجویٹ ہے مگر آج تک کہیں سلیکٹ نہیں ہو سکا۔ اللہ تعالیٰ نے شکل و شباہت بھی خوب دی ہے۔ افسر کی کرسی پر بیٹھا ہو تو افسر لگے۔ سیٹھ کی جگہ بیٹھا ہو تو سیٹھ ہی نظر آئے---- پوچھو تو کہتا ہے---- Backless آدمی ہوں کہیں فٹ نہیں بیٹھتا۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا Back کیا ہوتی ہے؟ میرے خیال میں Back کو بے شرمی سے تعبیر کر لیا جائے تو بہتر ہے---- اس طرح بات سمجھ میں آ سکتی ہے۔

کچھ دنوں سے میں دیکھ رہا ہوں خلیل پنسل دیکھنے کے بہانے بھبیری سے لمبی لمبی باتیں

کرنے لگا ہے۔ خلیل کی نگاہیں جھیری کی کوئلہ کی کانوں جیسی آنکھوں میں جھانکتی اور جھانکتی رہتی ہیں۔ عام مرد کی طرح اس کے بدن کا طواف نہیں کرتیں۔ نشیب و فراز میں ڈوبتی ابھرتی بھی نہیں۔ جھیری بھی بے خطر اس کے پاس کھڑی دیسی انار کے دانوں جیسے دانتوں کی نمائش کرتی رہتی ہے۔ خلیل سے باتیں کرتے ہوئے اس کے خاکستری چہرے میں رنگ ابھرنے لگتے ہیں۔۔۔۔ دفتر کے عملے کے لوگ اب ان دونوں کے متعلق مشکوک ہوتے جا رہے ہیں۔۔۔۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ ان دونوں کو عاشق معشوق سمجھنے لگے ہیں۔ لیکن میں ان کے اس خیال سے اتفاق نہیں کرتا۔۔۔۔ میں جانتا ہوں خلیل جیسا انقلابی آدمی اس قسم کی بات نہیں کر سکتا۔ ویسے میں نے خلیل کو جھیری سے بال پوائنٹ یا پنسل خریدتے کبھی نہیں دیکھا۔۔۔ ان کے درمیان کوئی چکر ضرور ہے جسے میں سمجھ نہیں پا رہا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ خلیل بھی مجھے کچھ بتانے سے گریز کر رہا ہے۔

جھیری میرے لیے بالکل غیر اہم عورت ہے مگر خلیل کی وجہ سے وہ اہمیت اختیار کرتی چلی جا رہی ہے۔ اب تو میں ہر وقت اس کے متعلق سوچتا رہتا ہوں۔ خلیل میرا دوست ہوتے ہوئے بھی مجھ سے کچھ چھپاتا ہے۔ اور میں اس نتیجے پر پہنچ رہا ہوں کہ اس کا دوست ہونا میرا واہمہ ہے۔۔۔۔ مجھے یہ بھی اچھا نہیں لگتا کہ جب خلیل جھیری کے ساتھ محو گفتگو ہو تو دفتر کے باقی لوگ اس کی طرف معنی خیز نظروں سے مسکرا مسکرا کر دیکھیں۔۔۔۔ ویسے وہ کسی کی پروا نہیں کرتا۔۔۔۔ جوتے پر رکھتا ہے۔

کل دوپہر وہ اس کا ہاتھ پکڑے اس کے ہاتھ کی ریکھائیں پڑھ رہا تھا اور سب ہنس رہے تھے۔ ہم لوگ اپنے ایسے ساتھی کو فلرٹ کرنے کی اجازت دے دیتے ہیں جو ہنوز بن بیاہا یا اکیلا ہو۔۔۔۔ ٹھرک جھاڑنے میں حرج بھی کچھ نہیں۔ ویسے خلیل کو اس کے معیار کے مطابق ایک سے ایک خوبصورت' پڑھی لکھی اور تقریباً ایک ٹرک جہیز والی لڑکی ہر وقت مل سکتی ہے۔۔۔۔ وہ ہاں تو کرے۔ وہ اس طرف آتا ہی نہیں۔۔۔۔ کچھ لوگ تجرد کی زندگی کا تجربہ بڑے ذوق شوق سے کرتے رہتے ہیں اور بعض کے ساتھ کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔۔۔۔ خلیل کی مجبوریوں کو مجھ سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے؟ اس کی مجبوریاں دو بہنیں تھیں جو بیاہی جا چکی ہیں۔ تیسری مجبوری ماں تھی جو مر گئی مگر وہ اب بھی مجرد ہے۔ پوچھو

تو کہتا ہے ---- میری مرضی۔ میری محبت' میری محبوبہ میرا مشن۔ میں اسے کہتا ہوں ایک کلرک کا مشن ہی کیا؟ یہ چونچلے ہمیں زیب نہیں دیتے۔ ہماری زندگی کا مقصد تو بس اتنا ہے کہ میز پر پھیلی فائلوں کو الٹ پلٹ کر کام چلاؤ۔ شام کو گھر جاؤ' کھانا کھاؤ ---- بیوی سے ٹانگیں دبواؤ' سو جاؤ ---- دوسرے روز پھر یہی۔ تیسرے اور چوتھے روز بھی۔ مگر خلیل مجرد رہنے کے مشن میں پھنسا ہوا ہے۔ میں تو کبھی کبھی یہ بھی سوچتا ہوں کہ وہ اس قابل ہی نہیں کہ جورو رکھ سکے۔ اگر ہوتا تو میری طرح آدھ درجن بچوں کا باپ ہوتا۔

خلیل بار بار بچے پیدا کرنے والوں کو برا کہتا ہے۔ کیا خبر ہم ہی اچھے ہوں جو اس کے نام لیواؤں میں اضافہ کرتے ہیں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا۔ وظیفہ ---- بھی عبادت ہے اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہوتا ہے۔ ایسی باتیں سوچ سوچ کر میرا دل اللہ کے پیار سے چھلکنے لگتا ہے اور میرا ایمان پختہ ہوتا جاتا ہے۔ سچ سچ ہم اس کے بندے ہیں۔ وہ قادر مطلق ہے اس کے حکم کے بغیر پتا نہیں ہل سکتا۔

کل جب وہ جھبیری کا ہاتھ پکڑے ریکھائیں پڑھ رہا تھا تو اس کا چہرہ کتنا سپاٹ اور جذبات سے عاری تھا ---- اور جھبیری ---- جھبیری تو ہے ہی بے حس ---- گلی گلی' دفتر دفتر گھوم گھوم کر بے حیا ہو چکی ہے۔ حیا اور حس میرا خیال ہے ایک ہی رد عمل کا نام ہے۔ اس کے مقابلے میں ہماری بیویاں؟ واہ نسوانیت کے نمونے ---- میں سمجھتا ہوں ہمارے طبقے کی سب خواتین ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی میری بیوی ---- میری بیوی کہا کرتی ہے۔ جب تم میری طرف گھور کر دیکھتے ہو میرے بدن پر چیونٹیاں رینگنے لگتی ہیں۔ اس کمبخت جھبیری کو دیکھو سیکڑوں نظروں کے نیزوں میں سے گزر جاتی ہے مگر جھرجھری تک نہیں لیتی اس سے زیادہ تو "بازاریں" باحس ہوتی ہیں۔ نگاہوں کی زبان کو تو سمجھتی ہیں! ---- کل وہ خلیل کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے بیٹھی تھی ---- اس کی آنکھوں کی ایک بات جو میں سمجھ پایا ہوں کچھ یوں تھی:

"اب کیا ہوگا؟"

اس کے گلے میں بیڑہ تھا اور بائیں باچھ میں پان' جیسے لوپی کے ہٹی ہو۔

آج صبح جب میں نے خلیل کو راستے میں روک کر تفصیل پوچھی تو پتہ ہے کیا کہا اس نے ۔۔۔۔؟ کہنے لگا۔

"ہم لوگ نہایت گندی ذہنیت کے مالک ہیں۔ بالکل غلامانہ۔ ہم لوگ جب ویت نامیوں کے لیے رو بلک رہے تھے تو ہمارے بنگالی بھائی ہم سے چھٹکارا پانے کی تجاویز سوچ رہے تھے۔ اب پی ایل او اور تیسری دنیا کے دکھ میں دن رات سلگتے ہیں۔ اپنے اندر روگ پل رہے ہیں۔ ہم ایک بہاری عورت کی مدد نہیں کر سکتے جو ہماری ذمہ داری ہے۔ پسلیں بیچنے کے ساتھ ہم نہیں سوچتے کہ وہ خود کن داموں بکتی ہے۔ بے چاری خاتون آخر۔ خلیل ایسی گری پڑی عورت کو خاتون آخر کہا کرتا ہے۔ خاتون اول جس کا بہت احترام اور مقام ہو۔۔۔۔ خاتون آخر جس کا کچھ بھی اپنا نہ ہو۔۔۔۔

خلیل کو دوسروں کے پھٹے میں ٹانگ اڑانے کی عادت ہے۔۔۔۔ ویت نام' پی ایل او' تیسری دنیا یا افغان مہاجرین؟ مجھے ان سے کیا لینا دینا۔۔۔۔ میرے تو اپنے دھندے ختم نہیں ہوتے۔ میں عام آدمی ہوں خاص بننے کی میں نے کبھی کوشش نہیں کی۔۔۔۔ بین الاقوامی مسائل پر اگر میں غور و فکر کروں بھی تو کیا کر لوں گا۔۔۔۔ میرے بس میں تو اتنا بھی نہیں کہ مہنگائی کے برابر اپنی آمدنی کر لوں۔۔۔۔ اگر کروں گا تو ناجائز سمجھی جائے گی۔ میں نچلی سطح کا ڈرپوک شہری ہوں جائز ناجائز کے چکر میں پڑتا ہی نہیں۔ مہینے میں چار چھ فاقے آ جاتے ہیں۔ کچھ ضروریات کو ہم بنیادی گردانتے ہی نہیں۔ حالات پریشان کریں تو گھر کے اندر ہی ڈنڈا سوٹا کر لیتے ہیں۔ داخلی حالات اور اندرونی معاملات خواہ کیسے ہی دگر گوں ہو جائیں ہم انھیں سدھاریں بھی تو کیسے؟ بنانے والے نے جو ہمارا مقدر لکھ دیا وہی تو ملے گا۔ تقدیر کو کون پڑھ سکا کہ کچھ تدارک کر سکیں۔۔۔۔ اور یہ خلیل! بیٹھ کے جھبیری کی ریکھائیں پڑھ رہا تھا۔۔۔۔ بھئی صاف ظاہر ہے کہ جھبیری اپنا لکھا بھوگ رہی ہے۔ پہلے بہار سے ہجرت کر کے بنگال پہنچی۔ اب بنگال سے ہجرت کر کے مرتی پڑتی یہاں آئی ہے تو کون جانے انت کیا ہوگا اس کا۔۔۔۔

کچھ لوگوں کے پاؤں کے ساتھ ان دیکھے پہیے بندھے ہوتے ہیں۔ کہیں ٹک کر بیٹھ نہیں سکتے۔

خلیل نے صبح میرے ساتھ بالکل بکواس کی کہ جھبیری بکتی ہے۔ ارے اس کا خریدار کون ہوگا؟ خواہ مخواہ مزہ لینے کے لیے بات کہہ دی۔۔۔۔ سوکھی لکڑی۔۔۔۔ بے جس اتنی کہ نیزے کی انی پر بھی چپکی اگی رہے۔۔۔۔ اس کا خریدار بس خلیل ہی ہوگا۔۔۔۔ سو فیصد نامرد۔۔۔۔ جیسے کو تیسا۔۔۔۔ اجی بکاؤ مال میں کوئی بات ہوتی ہے تو بکتا ہے۔

میں خلیل اور جھبیری کے متعلق سوچنا نہیں چاہتا مگر صبح سے سوچ جاتا ہوں۔ میں نے ان کے خیال کو کئی مرتبہ جھٹک دیا ہے۔ اس خیال سے کہ ان کے ہونے نہ ہونے سے مجھے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ جھبیری اور خلیل جیسے لاکھوں لوگ ہمارے اردگرد موجود ہیں۔

اس وقت دن کے بارہ بجے ہیں۔ میں اپنی میز پر پڑی فائلوں کو دو تین چکر لگوا چکا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم ان کا کیا کرنا ہے؟ یہ اسی طرح مختلف میزوں پر گھومتی گھامتی آخر الماری میں چلی جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ کوئی جلد باز آئے گا۔ افسروں کے کاندھوں پر قدم رکھتا ہوا میرے سر پر سوار ہو جائے گا۔۔۔۔ اب جو سر پر سوار ہو جائے' دن رات ایک کردے تو پھر اس کا کام کرتے ہی بنتی ہے۔۔۔۔ یا پھر پیسوں کے پہیوں والی گاڑی پر آئے۔ پیسے کے پہیوں والی گاڑی اگر رک نہ جائے تو کوئی کام نہیں رک سکتا۔ میں اس گاڑی پر سواری کم ہی کرتا ہوں۔ سوچتا ہوں کسی نے زنجیر کھینچ دی تو مجھے بچانے والا کوئی نہیں۔ یہ بھی تقدیر کے کھیل ہیں۔ ضروری نہیں سب کو سب کچھ مل جائے۔ محرومیوں کے ساتھ گزارہ کرنا سیکھ لینا چاہیئے ورنہ فرسٹریشن ہوگی۔ ویسے فرسٹریشن کا لفظ ہم کلرکوں اور نچلے طبقوں کے ملازمین کی لغت کا ایسا لفظ ہے جس کے ہزار نہیں بے شمار معنی ہیں۔

میں اس وقت دفتر کے قاصد کی تیار کردہ کالی چائے کی میلی پیالی سامنے رکھے آہستہ آہستہ اجازت کا سگریٹ پی رہا ہوں۔ اجازت کا سگریٹ میں نے اس لیے کہا کہ بیوی نے مجھے دن میں دو بار سگریٹ پینے کی اجازت دے رکھی ہے ایک دوپہر کو جب میں بہت تھک جاؤں۔۔۔۔ دوسرا رات کو جب میں اس سے میٹھی میٹھی پیار بھری باتیں کرتا ہوں۔ اس کے خیال میں دھوئیں کے مرغولے بڑے رومان پرور ہوتے

ہیں۔۔۔۔استراحت کی غرض سے میں نے اپنے دونوں پاؤں اوپر نیچے کر کے میز پر ٹکا لیے
ہیں بالکل اپنے افسروں کی طرح۔۔۔۔ مگر وہ اپنی گھومنے والی آرام دہ کرسی پر ہر طرف
گھوم سکتے ہیں۔ میں جہاں ہوں وہیں رہتا ہوں۔۔۔۔ سنا ہے خلیل کو چارج شیٹ ملی
ہے۔ اس کی وجہ بھبھیری ہے۔ خلیل تبھی کل سے نظر نہیں آیا۔ یہ تو طے ہے کہ ان
دونوں کے درمیان سیکس ویکس نہیں تھی۔۔۔۔ البتہ وہ بھبھیری کی آڑ میں 'بھبھیری
کے حوالے سے دفتر پر' دفتر سے باہر معاشرے پر' شہر سے آگے ملک اور ماحول پر تنقید کیا
کرتا تھا۔ کھلم کھلا برسا کرتا تھا۔۔۔۔ میں نے کہا تا! کہ وہ کچھ انقلابی ذہن کا آدمی ہے۔
سرکاری آدمی کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اتنا اونچا سوچے۔ چارج شیٹ میں یہ بھی لکھا ہے
"مسٹر خلیل! تم ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہو۔ تم معاشرتی' سماجی اور سیاسی جرائم
کے مرتکب پائے گئے ہو۔۔۔۔ کیوں نہ تمہیں کچھ عرصے کے لیے Suspend کر دیا
جائے تاکہ تمہیں اپنے آپ کو درست کرنے کے لیے وقت مل جائے۔۔۔۔" میں
آنکھیں میچے خلیل پر تصور باندھ رہا ہوں۔۔۔۔ "سٹرپز سٹرپز۔۔۔۔' لو بھبھیری عرف
خاتون آخر آگئی۔ آج پھر حسب سابق ہاتھوں میں بال پوائنٹ پنسلوں کا مٹھا پکڑے معمول
کے مطابق میز میز پھر رہی ہے اور۔۔۔۔ اور اس کی آمد ورفت پر کسی کو اعتراض نہیں۔

OOOOO

حرامی

اس کا نام نفرت سے بگاڑا گیا نہ پیار سے۔ بچپن سے جوانی تک عالم ہی رہا۔ اس کو عالم فاضل اور مہذب دیکھنے کے شوق میں ماں کی آنکھیں چندھیا گئیں پر عالم کو جو بننا تھا بن گیا۔

اسے جوانی کا احساس کچھ یوں ہوا جیسے کچی اور سوکھی لکڑی میں گھن پیدا ہو جائے آپ ہی آپ، فکریں دو چند ہو گئی تھیں اور ماں کہتی تھی جس کا پڑھا لکھا جوان بیٹا ہو اسے کس چیز کی کمی۔ بہنیں اس پر آس لگائے بیٹھی تھیں۔ ان کے آنچلوں کے نیچے ڈھکے ہوئے سر کب سفید ہوئے اور جگی جگی آنکھوں کے گرد کب جھریاں نمودار ہوئیں اسے پتا نہ تھا۔ اس کے پاس کتابوں کا علم تھا اور ایک بھاری ڈگری۔

عالم کو اس ڈگری میں قطعی دلچسپی نہ تھی۔ ہاں ماں اک اک سے اس کا ذکر کرتی اور فخر سے اس کا سر اٹھ جاتا اور پیلی اداس آنکھیں پھیل جاتیں۔ جیسے یہ ڈگری خود اس نے حاصل کی ہو۔

گھر پر ہمیشہ اداسی اور تناؤ کی کیفیت چھائی رہتی۔ بہتر زندگی کی خواہش کے کرب میں جتلا گھر کا ہر شخص خاموش اور مایوس رہتا۔ اپنی اپنی ذات میں گم۔ ان کی زندگیاں جو بڑوں کی

سی تھیں۔ ندی نالوں کا بہاؤ ان میں نہ تھا۔ عالم کو تعلیم مکمل کر چکنے کے بعد اپنی ذات پر اعتماد ہونے کی بجائے ناامیدی ہوئی۔ کیا خوب کہ وہ پتھر کا ایک حقیر ٹکڑا ہوتا شعور اور آگہی سے بے بہرہ۔ یوں پڑھ لکھ کر حساس طبیعت ڈرپوک ہو کر رہ گئی تھی۔

دوست اور عزیز الگ یاد دہانی کراتے رہتے۔

"میاں بڑی سی نوکری کر لو۔ کیا جھک مارتے ہو۔"

میاں عالم اس حقیقت کو جانتے تھے کہ غیرت مندی کے ساتھ ایک لقمے تک ہاتھ پہنچنا کتنا مشکل ہے۔ بڑی نوکری بہرکیف ستاروں پر کمند ڈالنے سے کم نہیں۔ ستاروں پر ہر شخص کمند نہیں ڈال سکتا۔ فقط دیکھ کر آنکھیں خیرہ کر سکتا ہے۔

صبح اس کا انٹرویو ہونے والا تھا۔ وہ لالٹین کی پیلی روشنی کے سامنے کاغذات پر جھکا ہوا جانے کیا پڑھ رہا تھا اور کیا سمجھ رہا تھا۔ پاس کی چارپائی پر ماں لیٹی ہولے ہولے کچھ بڑبڑا رہی تھی۔

"ماں تم کیا پڑھ رہی ہو؟"

اس نے بلا مقصد ماں سے پوچھا۔

"میں تمہاری کامیابی کی دعا مانگ رہی ہوں۔"

"آہاہا!"

وہ ہنسا اور اپنی کیرالین کی قمیض اتارتے ہوئے بولا۔

"ماں! یہ دھلوا دو۔ صبح تک سوکھ جائے گی۔ اچھے کپڑے کا دیکھنے والے پر اچھا اثر پڑتا ہے۔"

چند لمحوں بعد ماں قمیض دھو لائی اور الگنی پر پھیلانے کے بعد چپ چاپ کروٹ بدل کر بظاہر سو گئی۔ صبح اس کے بیٹے کا انٹرویو تھا۔ اور اس کا جی عجیب سا ہو رہا تھا۔

عالم کی نظر ماں کی مندی ہوئی آنکھوں پر اچانک پڑی۔ سیاہ گڑھے دھندلی روشنی میں تاریک اور عمیق تر نظر آتے تھے۔

"میری اچھی ماں! تو میرے لیے دعا مانگتی ہے ـــــ دنیا میں کونسا سکہ چلتا ہے۔ میں

نہیں جانتا اس لیے کہ تو نہیں جانتی تھی۔ تو نے ہمیں کھرا کرنے کی کوشش میں کھوٹا بنا دیا۔۔۔۔ ماں! تم عجیب ماں ہو۔۔۔ بالکل بیکار" وہ قدرے بلند آواز سے بولا۔

ماں نے پوچھا تو وہ کچھ بھی نہ بتا سکا۔ محبت اور احترام کے مارے اس کے اعصاب ساز کے تاروں کی طرح بج اٹھے۔ ماں کہہ رہی تھی۔

"تو بھی سو جا بیٹے۔ دیر سے سوؤ گے تو دیر سے آنکھ کھلے گی۔"

وہ بتی گل کر کے نیند کا انتظار کرنے لگا۔

موسم بہار کے دن تھے۔ عالم کو بستر میں گرمی لگ رہی تھی۔ رات کی گھمبیرتا روبہ زوال تھی۔ ساتھ پڑی چارپائی چرچرائی۔ عالم نے سانس روک لی۔ پھر ہلکی سرسراہٹ اور بھنبھناہٹ ہوئی۔ جیسے تتلی پھول کی پتی کو چوم رہی ہو۔ یا شہد کی مکھی شہد کی تلاش میں گھوم رہی ہو۔

عالم نے ماچس جلائی اور دیکھا ماں تکیے پر اوندھی گری کچھ بول رہی ہے۔

"ماں۔۔۔۔"

اس نے تڑپ کر پکارا۔

"میں تمھارے لیے دعا مانگ رہی تھی۔ سنا ہے دعائے نیم شبی میں بڑا اثر ہے۔"

"ماں! تو کتنی پیاری ہے۔"

وہ ماں کے ساتھ لپٹ کر بچوں کی طرح ایک ہی فقرہ دہراتا رہا۔

بہار کے دن اسی طرح آ کر گزرتے رہے تھے۔ عالم کو کبھی آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی فرصت نہ ملی۔

رنگ و بو سے رچے ہوئے مہینوں میں ہمیشہ امتحانات ہوتے۔ کھلے موسم کی البیلی ہوا۔ پھولوں کی متوالی مہک۔ وہ جھلینگا سی چارپائی پر کچی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے' کتاب کھولے' نتھنے پھیلا دیتا' نظریں ڈھلتے ہوئے آسمان پر دور دور چیلوں کی اڑان کا تعاقب کرتیں تو ماں سرزنش کر دیتی۔

"پڑھائی کی طرف خاک دھیان نہیں۔۔۔۔"

وہ ہر سرزنش کے بعد حواس مجتمع کر کے کتاب کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ گلی میں دھول دھپا کرتے کم سن چھوکروں کی آوازیں ہوا کے دوش پر اُڑتی اس کے کانوں کے ذریعے دل سے ٹکراتیں اور وہ سوچتا۔

"یاری اور شیدا دوسرے لڑکوں کے ساتھ بھینسیں چرانے جا چکے ہوں گے۔۔۔۔ یہ لڑکے خوش نصیب ہیں۔"

چند سال پہلے عالم کو سکول جاتے دیکھ کر یاری کی ماں بھی بیٹے کو سکول چھوڑ آئی تھی تو یاری کے گھر میں اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ بھلا پڑھائی میں دل اور دماغ کھونے سے فائدہ؟ پڑھ لکھ کر تو انسان بزدل ہو جاتا ہے۔ جی جان سے چلا جاتا ہے۔ یاری کا باپ بیوی پر بہت خفا ہوا۔ وہ آٹے دال کی دکان کرتا تھا۔ کئی تعلیم یافتہ کلرکوں کو ادھار سودا دے کر پچھتا رہا تھا۔ وہ اس سے کترا کر نکل جاتے اور مہینوں قرض ادا نہ کرتے۔ اسے پڑھے لکھے لوگوں کے بارے میں تلخ تجربہ تھا۔

اس جھگڑے کے بعد یاری اور عالم کا میل جول کم ہو گیا۔

اس کے برعکس عالم کے ابا کا خیال تھا کہ علم حیوان کو انسان بنا دیتا ہے اور کتاب سے بہتر کوئی دوست نہیں۔

عالم کبھی کبھار' چوری چوری گلی کے بچوں سے مل کر کھیل لیتا اور گھر آ کر خوف سے کانپتا رہتا۔ کہیں ماں نے دیکھ نہ لیا ہو۔ بڑی بہن نے شکایت نہ کر دی ہو۔ وہ تو شکر کہ ابا زیادہ وقت گھر سے باہر رہتے تھے۔ خاکسار پارٹی میں شامل ہو کر خاکسار ہو گئے تھے۔ گھر داری کا تمام بوجھ ماں کے کمزور کندھوں پر تھا۔

وہ انہماک سے مطالعے میں مصروف تھا۔ گلی میں کھڑے یاری نے مخصوص سیٹی بجائی۔ وہ کتاب بند کر کے کھسکنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ باورچی خانے سے ماں کی آواز آئی۔

"کیا بات ہے؟ کہاں جاتے ہو؟"

پھر وہ چیختی چلاتی باہر کے دروازے کی طرف لپکی اور ٹاٹ کے پردے کے پیچھے کھڑی ہو کر یاری کو دو چار گرم گرم سنائیں۔

اپنے گھر کے دروازے میں کھڑی یاری کی ماں نے سنا تو گویا پٹرول نے شعلہ پکڑ لیا۔ اسے گلی میں کھڑے ہو کر لڑنے کی بڑی مہارت تھی۔ وہ گالیوں طعنوں کی تال پر ہاتھ نچاتی' کلاسیکی رقص کے بھاؤ بتا رہی تھی۔ اور عالم نے دیکھا کہ اس کی ماں پردے سے الجھتی ہانپ رہی ہے اور اس کے سفید بال بکھر گئے ہیں۔ وہ کیا کہہ رہی ہے سنائی نہیں دیتا۔ اور گلی میں یاری کی ماں کا ڈنکا بج رہا ہے۔ اس لمحے عالم کو ماں پر غصہ آیا اور رحم بھی۔ پھر وہ اسے گھسیٹتی ہوئی اندر لے گئی۔ تڑاخ تڑاخ کئی طمانچے اس کے منہ پر برسے۔

"جاہل حرامی چھوکروں کے ساتھ کھیلے گا۔۔۔۔"

دونوں بہنیں سہمی ہوئی اسے پٹتے ہوئے دیکھتی رہیں۔۔۔۔ اف وہ کس قدر بے حس تھیں۔ عالم کو ان سے سخت نفرت محسوس ہوئی۔ اس پر تنہائی اور کسمپرسی کا احساس غالب تھا۔

پٹائی کے بعد ماں کچھ دیر ہانپتی کانپتی بیٹھی رہی پھر نہ معلوم کیا ہوا کہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"اونہہ۔۔۔۔"

عالم کے جی میں قطعی ہمدردی نہ تھی۔ ماں کو روتا دیکھ کر بہنوں نے منہ بسور لیے اور ماں نہایت سلیقے کے ساتھ آنسو پونچھتی رہی۔ یوں سوسائٹی کے افراد کا غصہ' نفرت' بغاوت' آنسوؤں کی صورت میں بہتا رہا۔ تہذیب نہ کھل کر رونے دیتی ہے نہ ہنسنے۔

رات کو ابا واپس آئے تو انہوں نے اسے پیار کیا نہ ماں کو شاباش دی' بس ناراض ہوتے رہے۔

ہمسایوں کے ہاں کوئی تقریب تھی۔ لڑکیوں کے گانے اور ڈھولک کی آواز لیموں اور مالٹے کے پھولوں کی خوشبو کے ساتھ مل کر دھوم مچاتی پھرتی تھی۔ وہ ریاضی کے سوالات حل کرتے کرتے تھک چکا تھا۔ دوسرے دن پرچہ تھا۔ ابا حقہ گڑگڑاتے اونگھ رہے تھے۔ بہنیں دم سادھے لیٹی تھیں جیسے اوائل عمر کی میٹھی نیند میں ہوں۔ ماں اس کے پاس بیٹھی سوت اٹیر رہی تھی۔ رات بھیگی تو ڈھولک کی دھم دھم زیادہ واضح ہو گئی۔

"لوگوں کو شادی بیاہ کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں ہے۔"

عالم نے بیزار ہوتے ہوئے کہا اور کتاب بند کر دی۔

لیکن ایک خیال اسے بار بار آتا رہا۔ ان کے گھر میں اتنا ٹھہراؤ اور اتنی اداسی کیوں ہے؟ نہ کسی کا بیاہ ہوتا ہے نہ کوئی نیا فرد آتا ہے اور ماں ہر وقت کہتی رہتی ہے۔

"اچھا وقت آئے گا۔ ہم کوئی ایرے غیرے تو نہیں کہ معمولی معمولی خوشیوں پر جی چھڑکتے رہیں۔"

عالم جوں جوں بڑا ہوتا گیا اسے اپنے گھر کی عسرت کا خیال ستانے لگا۔ ابا اس کی جوانی پر آس لگائے بیٹھے تھے۔۔۔۔ بڑا ہو کر سب کچھ کر لے گا۔۔۔۔ تنخواہ لا کر بیوی کے ہاتھ میں دے دی۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ وہ جانے اس کا کام۔ ماں کو اپنے دکھوں کا مداوا عالم ہی میں نظر آتا تھا۔

یاری کی بہنوں کی ایک ایک کر کے شادیاں ہو چکی تھیں۔ اب وہ جب کبھی میکے آتیں تو بھینسوں کے گوبر تھاپنے کے بجائے اپنے بچوں کا گوموت دھوتی نظر آتیں۔ وہ کس قدر خوش و خرم تھیں اور کیسی صحت مند۔۔۔۔ کبھی چھت پر بیٹھے بیٹھے کتاب سے بھٹکتی نظریں یاری کے صحن میں جا پڑتیں تو عالم کو ایسے محسوس ہوتا کہ بھینسوں کے گوبر کی بو کے ساتھ تندرست بدنوں کی باس گڈمڈ ہو رہی ہے۔ اور تفکرات میں الجھے ہوئے ذہن میں ایک احساس سر اٹھاتا ہے اور اسے جھٹکا سا لگتا ہے۔۔۔۔ شاید یہ جوانی کا احساس تھا۔

ویسے عالم کو محبت کا تجربہ کبھی نہ ہوا۔

البتہ بستہ پکڑے پُل پر سے گزر کر سکول جاتی وہ لڑکی اسے اکثر یاد آتی۔ جو آنکھیں جھکائے اپنی دھن میں چلتی رہتی تھی اور جس کی صورت کچھ کچھ اس کی چھوٹی بہن سے ملتی تھی۔ شاید یہ محبت تھی۔۔۔۔ شاید محبت لمحے کے اس ادراک کا نام ہے جو دھیرے سے سینے میں آ کر بس جاتا ہے اور سورج کی پہلی کرن کی طرح مبہم اور روشنی کا امین ہوتا ہے۔۔۔۔ پر اسے ایسی امانت سنبھال کر رکھنے کی فرصت کہاں تھی۔

وہ اپنا تمام تر وقت مطالعے میں صرف کرتا اور خیالوں میں اتنا بڑا ہو جاتا کہ باقی

تمام لوگ اسے اپنے سامنے بونے دکھائی دیتے۔

ابا کی معمولی تنخواہ سفید پوشی کے بھرم میں اٹھ جاتی۔ اکثر مہینے کی آخری تاریخیں فاقوں میں گزرتیں۔ فاقہ مستی اور وقار کا خیال سب کے حوصلے پست کیے رکھتا۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ کم سے کم گفتگو کرتے۔

بہنوں نے جس طرح سینت سینت کر قدم رکھے نوجوانی اور جوانی کی راہوں کو عبور کیا تھا۔ عالم کو اس کا پورا احساس تھا۔ ان کے کردار پر کوئی دھبا نہ تھا۔ دلوں پر کیسی کیسی قیامتیں گزار کر اک نیک نامی حاصل ہوئی تھی۔ عالم کو کیا معلوم۔ وہ تو علم کے سمندر کے کنارے کھڑا لہریں گنتا رہا اور امیدوں کے خوبصورت سنگریزے چن چن کر جیبیں بھرتا رہا۔ اور اب بوجھ اس قدر زیادہ ہو گیا تھا کہ اس سے چلا نہ جاتا تھا۔

تعلیم مکمل نہ ہوئی تھی کہ فسادات شروع ہو گئے۔ انہیں ہنگاموں میں ابا اللہ کو پیارے ہوئے۔ افراط و تفریط کا زمانہ تھا۔ عالم نے دل برداشتہ ہو کر کسی قصبہ کے سکول میں ملازمت اختیار کر لی اور ماں بہنوں کو ساتھ لے گیا وہ اس شہر کو اس طرح خیرباد کہہ گئے گویا مشرقی پنجاب سے ہجرت کر رہے ہوں اس شہر نے اتنی جدوجہد اور شرافت کے باوجود انہیں کیا دیا تھا۔

کبھی کبھی دل برداشتہ ہو کر عالم سوچتا۔ کاش وہ ہجرت کر کے ہی آئے ہوتے۔ کم از کم لوگوں کے دلوں میں رحم اور ہمدردی کے جذبات تو ہوتے یا پھر سارا خاندان قتل ہو جاتا۔ یا کم از کم اس کی بہنوں کو ٹھکانے لگا دیتا۔ وہ تو پتھر کی مورتیاں بنی' اس کا منہ تکتی بوڑھی ہو چکی ہیں۔ وہ اس انتظار میں ہیں کہ گھر اور بر خود چل کر ان تک آئیں۔ وہ خود ہی بھاگ جائیں' چلی جائیں۔ وہ زیادہ تلخی سے سوچتا۔ حد ہے' فرد اپنے ہر عمل کے لیے خود ذمہ دار ہے۔ پر اس کی شادی کوئی کرے---- سوسائٹی کرے---- واہ---- شرافت کیا ہے؟ شرافت کا پرچار فرد کو بزدل اور تابع بنانے کا حربہ ہے۔ اور کمزور لوگ اس خول میں رہ کر بڑے خوش رہتے ہیں۔ اور کہتے ہیں ہم سچے ہیں اور اچھے ہیں۔

اچھی زندگی کا متلاشی عالم بچپن سے کش مکش کا عادی تھا۔ اس نے نوکری کے ساتھ تعلیم جاری رکھی۔ آخری ڈگری حاصل کرنے تک اس کی عمر اٹھائیس تیس برس کے لگ بھگ تھی۔ سرکاری ملازمت کی امید بالکل ختم ہو چکی تھی۔ پھر سفارشوں اور کنبے کمانے کا زمانہ۔ البتہ ملک صنعتی ترقی کی طرف گامزن تھا۔ کئی سکیمیں اور منصوبے بن رہے تھے۔ ملیں اور کارخانے' فرمیں اور دفتر' سیکڑوں پرائیویٹ ملازمتیں۔ عالم کو ڈھارس بندھی۔ وہ انگریزی اخبار محض نوکریوں کے اشتہار دیکھنے کے لیے خریدتا۔ درخواستیں اور سرٹیفکیٹوں کی نقلیں ہر روز روانہ ہوتیں مگر کہیں ہاتھ نہ پڑتا تھا۔

آج ایک معقول ملازمت کے سلسلے میں انٹرویو ہونے والا تھا۔ اتھارٹیز نے اسے کال بھیجی تھی۔ وہ کبھی خوش ہو جاتا اور کبھی خوف زدہ اور کبھی افسردہ۔ وہ سوچتا تھا فرم کا مالک کیسا ہوگا؟ فرفر انگریزی بولتا ہوگا۔ اور چھوٹے سکولوں میں کام کرنے سے اسے انگریزی بولنے کا کمپلکس ہو گیا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کی زبان سے' دیسی زبان کے کئی الفاظ یوں غائب ہو گئے جیسے وہ غلامی کا طوق تھے اور ان کو اتار پھینکنا نہایت ضروری تھا۔ معمولی لوگ انگریزی میں بات چیت کرنے میں فخر محسوس کرتے۔

جو زبان یا رسم ورواج نچلے طبقے میں چلے جائیں ان کی جڑیں زمین میں پیوست ہو جاتی ہیں اور تہذیب کے پردے کو پیوند لگ جاتا ہے پاکستان میں نئی تہذیب جڑیں پکڑ رہی تھی اور عالم جیسے سچ سوچنے والے لوگ جس تس کا منہ تکتے' حیران تھے۔ آب حیات کی صراحی سے قطرہ قطرہ دن بہے جاتے تھے۔

"حرامی ہے وہ شخص جس نے وقت کے تخم سے جنم نہیں لیا۔۔۔۔"

وہ سوچتا اور ماں سے بحث کرنے لگتا۔ لیکن ماں ہمیشہ تحمل سے جواب دیتی۔

"ہم روایت سے بغاوت نہیں کر سکتے۔ ہم اقدار کی سیڑھیوں پر قدم قدم چڑھتے منزل تک پہنچے ہیں' اب نیچے نہیں آ سکتے۔۔۔۔ نیچے موت ہے۔"

اخلاقی معیار کے سنگھاسن پر بیٹھی ماں اسے سمجھاتی رہتی۔

"دو قسم کے لوگوں کے لیے جی جلانا مقدر ہے بیٹے۔ ایک وہ جو اپنے دور سے پیچھے

رہیں۔ دوسرے وہ جو آگے بڑھ کر سوچتے ہوں۔"

اور جب وہ پوچھتا کہ ماں تمہاری دانست میں ہم کہاں ہیں؟ تو ماں تسلی بخش جواب نہ دے پاتی اور وہ تلملا کر رہ جاتا۔ اپنے بارے میں وہ خود جانتا تھا کہ اس میں باغی اور انقلابیوں والی صلاحیتیں قطعی نہیں۔ وہ تو اس شکست کا اعتراف تھا جو ذات اور زمانے کی کش مکش کا نتیجہ ہوتی ہے۔

رات ہولے ہولے بیت رہی تھی۔ کب سویرا ہوگا۔ کب سورج کی حیات بخش روشنی پھیلے گی---- وہ سوچتا رہا' جاگتا رہا۔

بڑی بہن نے ناشتہ تیار کیا لیکن عالم کی طبیعت بھری ہوئی تھی۔ جیسے آج اسے پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔

وہ چائے کے دو چار گھونٹ پی کر ریل گاڑی میں سوار ہوگیا۔ دن طلوع ہونے تک وہ اپنے پرانے اور مانوس شہر میں پہنچ گیا۔ شہر کے سکوت نے اسے آغوش مادر کی طرح خوش آمدید کہا۔

"ارے کہاں رہے اتنے دنوں؟"

جیسے شہر پوچھتا ہو۔ عالم کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

اب ہم واپس آ جائیں گے۔ یہیں رہیں گے۔ نوکری مل جائے گی۔ ایک دم تین سو روپے---- پیسے اور پیٹ کے لیے لوگ اپنے پیاروں کو بھی چھوڑ جاتے ہیں---- ہیں نا؟ وہ اپنے ساتھ' شہر کے ساتھ گفتگو کرتا ہوا چل رہا تھا۔

فرم کی بلڈنگ کتنی بڑی تھی۔ عالم نے اس کے سامنے پہنچ کر ٹھنڈی سانس لی۔

"ارے ابھی کل تو یہاں جوہڑ تھا---- دنیا کتنی جلدی بدل جاتی ہے----

دفتر کے اوقات کار ابھی شروع نہ ہوئے تھے۔ وہ وقت گزارنے کے لیے لانز میں ادھر ادھر ٹہلتا۔ انٹرویو کے لیے جوابات تیار کرتا رہا حتیٰ کہ لوگ آنے لگے۔ وہ برآمدے میں بچھی ہوئی بنچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ چپڑاسی اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور پوچھا۔

"امیدوار ہیں----"

"جی----"

"بڑے صاحب تو دیر سے آئیں گے۔ پھر ان تک پہنچنا۔ اللہ رے توبہ----"

چپڑاسی نے خود ہی بتایا اور معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

"بابو! کوئی سفارش ہے----"

"نہیں----"

عالم نے پھر مختصر جواب دیا۔

"مگر بابو! اتنے علم کے ساتھ ایک ماہ کی محنت کے بعد تین چار سو روپے کا منہ دیکھو گے---- کوئی کاروبار کرو----"

عالم وہاں سے اٹھ کر برآمدے میں گھومنے لگا۔ چپڑاسی کی گفتگو اسے مایوس کیے دیتی تھی---- جاہل کہیں کا اسے کیا معلوم کہ تین سو روپے کیا چیز ہیں---- سالا جلتا ہے---- وہ جو اندر فائلوں پر جھکے کام کر رہے ہیں سب بیوقوف ہیں---- تین سو روپے کا مطلب ہے تیس ہزار پیسے۔ ان کے بارے میں سوچتے ہوئے تو زندگی کی تین لاکھ سانسیں بڑھ جاتی ہیں۔

اب اس پر مایوسی کا غلبہ کم سے کم تھا اور وہ بڑی پُرامید باتیں سوچ رہا تھا---- اگر صاحب نے سلیکٹ نہ کیا تو کیا واپس بھی نہ لوٹنے دے گا۔ لیکن برآمدے کے ستون سے لگ کر کھڑا چھریرے بدن کا نوجوان بار بار رومال سے پیشانی پونچھ لیتا اور اپنے کاغذات کو الٹنے پلٹنے لگتا۔ ذرا پرے کھڑکی کے پاس کھڑے چھوکرے سگریٹ پر سگریٹ جلائے جاتے تھے اور اعتماد کے ساتھ بلند آواز میں گفتگو کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

بلڈنگ کا پچھلا حصہ زیر تعمیر تھا۔ مشینیں اور انسان کام میں جُتے تھے۔ بھیگے ہوئے سیمنٹ کی سوندھی خوشبو بھلی لگتی تھی۔

مزدوروں کے کسرتی بدنوں کو دیکھ کر عالم کو اچھی صحت کی تمنا کچھ اس طرح ہوئی جیسے کوئی بوڑھی کنواری' مرد کی آرزو کرے۔ وہ خود کیسا دبلا پتلا اور کمزور تھا۔ بہتر زندگی کے حصول کی جدوجہد اس کے جسم کے ساتھ امربیل کی طرح چمٹی خون کو چاٹ گئی تھی۔

دنیا کتنی مصروف جگہ ہے اور انسانوں کا کام مشینیں کرنے لگی ہیں۔ لوگ کیا کریں گے۔۔۔۔ ضروریات اور خواہشات کا کیا ہوگا؟ لوگ اپنی سبھی خواہشات کو مار کر ہائیڈروجن بم کی خواہش کرنے لگیں گے۔۔۔۔ خواہش۔۔۔۔ خواہش۔۔۔۔ تمنا۔۔۔۔ پھر حسرت۔۔۔۔ پھر موت۔

عالم بے کار سوچے جاتا تھا اور طبیعت اداسی اور ملال کی طرف مائل تھی۔

دن کے دس بج چکے تھے۔ ابھی انٹرویو بورڈ نے کارروائی شروع نہ کی تھی۔ دفتر کے ملازمین امیدواروں کو رحم بھری نظروں سے دیکھتے تھے۔ وہ نظریں ہٹا کر بلڈنگ کی چھتوں اور دروازوں کو دیکھنے لگا۔

کوئی اس کے عقب سے پکارا۔

"انٹرویو دینے والے حضرات آ جائیں۔۔۔۔ آن کی آن میں کئی لوگ جمع ہو گئے پھر وہ مشتبہ لوگوں کی طرح اپنا اپنا نام ٹک مارک کرواتے ہوئے گزرنے لگے۔ اتفاق سے عالم پہلے نمبر پر تھا۔۔۔۔ انتظار گاہ میں بیسیوں امیدوار چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔

انٹرویو بورڈ کے سامنے جاتے ہوئے وہ ایسے محسوس کر رہا تھا جیسے وہ نہیں اس کا ہمزاد سب کچھ کر رہا ہے۔ وہ تو بس چپ ہے اور دیکھتا ہے۔ اسے ذھب سے نہ تو سنائی دیتا ہے اور نہ ہی سجھائی دیتا ہے۔

"تشریف رکھئے۔۔۔۔"

کسی نے کہا۔۔۔۔ عالم نے دیکھا سامنے چھ سات مرد بیٹھے ہیں۔ اور ان میں ایک جانی پہچانی صورت ہے۔۔۔۔ وہ کون ہے؟

"یاری۔۔۔۔ او یار۔۔۔۔"

عالم کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"پوچھو جی۔۔۔۔ پوچھو۔۔۔۔"

"یس سر۔۔۔۔"

پہلا شخص بولا۔

جانے ادھر سے کیا سوال ہوا۔۔۔۔ عالم بولنے لگا۔

"اوئے یاری تیری بھینسیں کہاں گئیں؟ اور تیرے باپ کا کیا حال ہے؟ پرچون کی دکان پر کھٹی مٹھی گولیاں بیچتا ہے اور تیری بہنیں گوبر تھاپتی ہیں کہ نہیں؟"

"یاری۔۔۔۔ اوئے یاری۔۔۔۔"

کسی نے اسے عقبی دروازے سے باہر دھکیل دیا۔

"پاگل۔۔۔۔ حرامی۔۔۔۔"

کوئی غصے سے دروازے کے پٹ بند کرتا ہوا کہہ رہا تھا۔

عالم سڑک پر بلامقصد بھاگ کھڑا ہوا۔

"ماں۔۔۔۔ ماں۔۔۔۔ پاگل۔۔۔۔ ہاہا۔۔۔۔ تو نے مجھے وقت کی بوند سے نہیں جنا۔ نہ اس بہتے پانی سے میری آبیاری کی۔ میں حرامی ہوں۔۔۔۔ اور تو فریب خوردہ عورت۔۔۔۔ ہاہا۔۔۔۔ وہ ڈوکیومنٹس اور سرٹیفکیٹوں کے پلندے کو سینے سے لگائے بکے جا رہا تھا۔ کائنات اور دھرتی کی کوکھ کو وقت نے سیراب نہیں کیا ماں! میں حرامی ہوں۔ حرامی ہوں۔ میں وقت کا بیٹا نہیں ہوں۔

(1968ء)

OOOOO

گندی مچھلی

"بڑے صاب! میں بد نہیں ہوں۔ جس طرح نیکی کسی کی میراث نہیں اسی طرح بدی پر بھی کسی کی اجارہ داری نہیں۔ جس دن میں پیدا ہوئی مجھے معلوم نہیں تھا نیکی کیا ہے بدی کیا ہے۔ مجھے کیا کسی کو بھی پتا نہیں ہوتا۔ میں جو کچھ ہوں وہ نہیں ہوں پر میں ثابت نہیں کر سکتی کیوں کہ میں خود ثابت نہیں ہوں۔ نہ میرا کوئی آگا ہے نہ کوئی پیچھا۔ اور میں یہ بھی نہیں جانتی کہ میں اس دنیا میں آکیسے گئی۔ یہ طے ہے کہ میں کسی کھیت میں نہیں اُگی' کسی مشین نے مجھے نہیں بنایا۔ کسی مرد نے کسی عورت کے بدن سے ہی مجھے جنوایا ہوگا۔ دنیا کا یہی چلن ہے۔ پھر دنیا میرے لیے سمندر بن گئی۔ بڑے صاب! میں ان باتوں کو بہت جان گئی ہوں۔ اتنا تو شاید جناب جی نے بھی نہیں جانا ہوگا۔ کیوں کہ آپ ساحل پر ہیں اور میں سمندر میں۔ میں نے گر کر دنیا دیکھی ہے' کون بنے گا میرا ضامن؟ کاغذی کارروائیاں نہ کرو' فیصلہ کرو۔ جیل جاؤں دعائیں دیا کروں گی----ہاہا----"

چھیمو حوالاتن کے ہنسنے سے حاضرین میں بھنبھناہٹ سی ہونے لگی۔ بعض کے ماتھوں پر گہری شکنوں کی چکیں تن گئیں۔ ہونٹ بھنچ گئے' نتھنے پھڑپھڑانے لگے۔ مجسٹریٹ نے ایک تشویش ناک نگاہ حاضرین پر ڈالی اور پیشکار کو کمرہ خالی کرانے کے لیے کہہ کر خود فائل کی طرف متوجہ ہوگیا۔

کچھ لوگ چلے گئے۔ کچھ دروازے تک رینگ کر رک گئے۔ کچھ نے صرف پہلو بدلا۔

کیونکہ زندہ ڈرامے روز روز دیکھنے کو نہیں ملتے۔ کارروائی جاری رہی۔

"تمہیں پتا ہے تم حوالات میں کیوں لائی گئی ہو۔۔۔۔؟"

پاس کھڑے ہیڈ کانسٹیبل نے دبے لہجے میں چھیمو سے پوچھا۔

"تم نہیں' بڑا صاب مجھ سے پوچھے۔۔۔۔ دتے۔"

"بکو مت۔" مجسٹریٹ نے جھڑک دیا۔

"یہ دلا نہیں تو کیا ہے؟ ہزار بار دلا۔ اس سے پوچھو اس نے مجھے کتنی بار ادھر بھیجا۔ ہر بار کہتا تھا تم آزاد ہو جاؤ گی۔ نہیں چاہیئے مجھے ایسی آزادی۔ جس میں بدن گنے کی طرح پیلا جائے۔ مجھے جیل بھیجو۔ سنا ہے جیل' حوالات سے بہتر ہے۔ لچے لفنگوں کی دنیا سے پرے کال کوٹھڑی میرے لیے اچھی رہے گی۔ دیکھو نا جی! میرا ناک نقشہ اچھا ہے۔ رنگ بھی گورا ہے۔ کہتے ہیں گورا رنگ نہ کسے نوں رب دیوے کہ سارا پنڈ ویری ہو گیا۔ اور میں تو ہوں ہی گوری۔ یہ دیکھو۔" وہ ایک دم شوخی پر اتر آئی۔ اس نے پھولدار کالی قمیض کا گلا نیچے تک کھینچ لیا جہاں مکھن کے دو گول پیڑوں نے ایک گہری تکون بنا کر لکیر سی بنا دی تھی۔ سچ مچ وہ بہت گوری تھی۔ مجسٹریٹ کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ ارد گرد کھڑے لوگ گڑبڑاہٹ اور نیم مسکراہٹ میں مبتلا ہو گئے۔ مجسٹریٹ نے کڑک کر کہا:

"تم بڑی لفنگی ہو اور ہوشیار بھی۔"

"سب ہی کہتے ہیں۔ ہوشیار نہ ہوتی تو لوگ اب تک کھا چکتے۔"

پھر اس نے کولھوں پر دونوں ہاتھ ٹکا کر حاضرین پر طائرانہ نظر ڈالی جیسے کچھ کہہ دینے کی شہ پا چکی ہو۔

"بڑے صاب! ایک بات پوچھوں؟۔۔۔۔ جب میں سچ مچ برے کام کرتی تھی تب پولیسیے' مجھے پکڑتے تھے' چھوڑ دیتے تھے۔ اب میں نے اپنے حساب سے نیک کام کرنے کی ٹھانی' یہ لوگ پرانے روگ کی طرح جان کو لگ گئے۔ کیوں؟ آخر کیوں؟"

"سوال مت کرو۔ بیان لکھاؤ۔" مجسٹریٹ نے نخوت سے کہا۔۔۔۔ "عدالت کا وقت ضائع نہ کرو۔"

چھیمو نے اپنی تیکھی ناک پر انگلی رکھ کر پوچھا۔

"ہائے ہائے! کیسے مرد ہو؟ ایسے ایک تم ملے یا وہ۔ میں خود اس پر عاشق ہو گئی۔ اس کا نام سن کر ہی دل دے بیٹھی۔ بن دیکھے تو سستی' پنوں پر عاشق ہوئی تھی۔ میں شاید سستی ہوں پر وہ پنوں نہیں تھا۔"

"آپ نرمی سے کام لے رہے ہیں سر! اور وہ اوٹ پٹانگ بکے جا رہی ہے"

عدالت میں موجود ایک وکیل نے مجسٹریٹ کو متوجہ کیا۔ لیکن مجسٹریٹ نے وکیل کو ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ چھیمو حوالاتن مزید تن کر کھڑی ہو گئی۔ اب وہ وکیل سے مخاطب تھی۔

"دفع ہو کالے کوٹ۔ تو بیچ میں مت بول۔ اس وقت سرکار میرے ساتھ ہے"

چھیمو نے لگاوٹ بھری نگاہ نوجوان مجسٹریٹ پر ڈالی وہ شرما کے رہ گیا۔ اس نے جیب سے رومال نکالا۔ پیشانی صاف کی۔ قمیض کے کالر کو پیچھے ہٹایا۔ سر پر چلتے برقی پنکھے کو دیکھا جیسے گرمی کا شاکی ہو۔ پھر گلا صاف کر کے بولا۔

"سن بی بی! اس وقت سے تم نے ایک بھی کام کی بات نہیں بتائی۔ پتا ہے اس بک بک کا نقصان کسے ہو گا؟---- تمہیں---- تمہیں۔"

"صاب! کیا نفع' کیا نقصان۔ میرا کھاتا شراکت داری کا ہے۔ یہ ٹھیک ہے نقصان میرا ہی ہوتا ہے۔ اس شراکت داری میں کون کون ہے کس کس کا نام لوں۔ سنتری سے لے کر سپرنٹنڈنٹ تک اور اس سے اوپر والے---- ہا!---- میرے لیے تو سب اوپر والے ہیں۔ مجھے ہر مرد خدا نظر آتا ہے۔ قہار' جبار۔ اور جب میں اس کے قرب میں ہوتی ہوں تو وہ غفار ہوتا ہے جیسے سارے گناہ میرے ہیں اور وہ ستارالعیوب ہے۔ اب دیکھو نا! جب میرے پیٹ میں پہلا پاپ پلنے لگا تو میرے شراکت دار نے مجھے ایک دائی کے حوالے کر دیا۔ میں ادھ موئی ہو گئی اور وہ اپنی بیگم کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتا تھا۔

"جمیلہ بیگم---- جمیلہ بیگم----! مرد کا وقت ایک عورت سے پورا نہیں ہو سکتا۔

اسلام نے تبھی چار کی اجازت دی ہے۔ کنیز کے ساتھ تعلقات جائز ہیں جمیلہ! میری جان!"

"مگر چھیمو آپ کی کنیز نہیں۔ نوکرانی ہے۔ تمھارے ہاتھوں میں پلی ہے۔"

جمیلہ بیگم سب باتیں رو رو کر کہہ رہی تھی۔ کیوں کہ میں اسے سوتن کے روپ میں دکھائی دیتی تھی۔۔۔۔ پھر جناب جی! جب میری صحت کچھ اچھی ہوئی تو میری عقل سمجھ بھی پہلے سے اچھی ہو گئی۔ نظر نظر کا فرق میری سمجھ میں آگیا۔ مجھے اپنے مقام اور مصرف کا پتہ چل گیا۔۔۔۔

پھر گلی میں آنے والا ایک بنجارہ دل کو بھا گیا۔ نہ جانے کیوں جوان لڑکیوں کو پردیسی اور بنجارے پیارے لگتے ہیں۔ بنجارے کے گیت تو آپ نے بھی سنے ہوں گے صاب!

"گلی گلی بنجارا پھردا ونگاں لوو چڑھا۔۔۔۔ میں ونجارا۔۔۔۔"

وہ مجھے چوڑیاں 'کلپ' کانٹے ایسے ہی دے دیتا بغیر پیسوں کے۔ وہ میرا ہانی ☆ تھا۔ آپ کو پتہ ہے ہان کو ہان پیارا ہوتا ہے۔ میں نے اس ہان کو اپنی جان جانا اور ایک دن چپکے سے اس کے ساتھ ہو لی۔ میں نے جمیلہ بیگم اور اس کے تھانیدار آدمی کو ایک دن بھی ماں باپ جیسا نہیں پایا۔ میرا ان کا رشتہ بس نوکر مالک کا تھا۔ پھر بھی اس گھر سے نکلتے ہوئے بہت روئی جیسے وہ میرے بابل کا گھر ہو اور میں "گڈیاں پٹولے" چھوڑ کر نیا گھر بسانے جا رہی ہوں۔۔۔۔ اب بھی یاد آتا ہے مجھے وہ گھر۔

خیر صاب! بنجارے کی ماں بہنیں بھی پوری پوری بنجارنیں تھیں انھوں نے مجھے نہ قبولا۔ ایک ہی بات کہتی تھیں "کہاں سے اٹھا لایا اٹھائی گیرے؟ یہ چھوکری بسنے کی نہیں۔ ہائے ہائے کیسے کیسے ارمان تھے سہرے کے پھولوں کے۔ لاگ کے۔ رسموں کے۔"

بنجارے نے ماں بہن سے ڈر کے مجھے ایک بڈھے بساطی کے حوالے کر دیا۔ اور وعدہ کیا میں جلد ہی ماں بہن کو منا لوں تو تجھے دو بول پڑھا کر ساتھ لے جاؤں گا۔ دو بولوں کے انتظار میں میرا کڑاکا بول گیا۔ بڈھے بساطی نے دکان کے چوبارے میں مجھے ایسے رکھا کہ آس پاس والوں کو بھنک نہ پڑے۔ باہر آتا جاتا تو چوبارے کو تالا لگا جاتا۔ بالکنی کی

کھڑکیوں پر پترے چڑھوا دیئے۔ یہ بساطی والا میرے لیے رات کو ہار' عطر پھلیل اور نہ جانے کیا کیا الا بلا لے کر آتا تھا پر صاب! میرا جی خوش نہیں تھا۔ ہر وقت اڑانیں بھرنے کو جی چاہتا۔ بڈھا شکل شان کا بھی ایسا ہی تھا ایک آنکھ سے ٹیرا۔" چھیمو نے وہیں کھڑے کھڑے دائیں آنکھ کا ڈھیلا گھما دیا۔ "ایسے۔۔۔۔" میں تو اسے دو دو نظر آتی ہوں گی تبھی تو اتنی چیزیں اٹھا لاتا تھا میرے لیے۔ پراندے' ہنسی' کلپ' سرخی' پوڈر۔۔۔۔ میں نے ایک روز چڑ کر اپنے لمبے بال کاٹ دیئے۔ بڈھا بہت ناراض ہوا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ روز روز دھونے مشکل تھے۔ وہ خوش ہو گیا۔ کچھ جھینپ کے ساتھ۔ یہ بال اسی دن سے کٹے ہوئے ہیں اور میں آرام میں ہوں۔ ایک دن کیا ہوا" وہ کھکھلا کر اور تالی بجا کر ہنسی۔ "بڈھا بساطی جانے کیوں صبح کو اٹھ نہ سکا۔ بولا میرے لیے پانی گرم کرو۔ میں نے کہا میں تمھاری بیوی نہیں بڈھے۔ اٹھو اور بازار سے ناشتہ لے کر آؤ مجھے بھوک لگی ہے۔ لیکن اس نے مجھے دھکیل کر پلنگ سے نیچے گرا دیا۔ اور چلایا۔

"ذلیل۔۔۔۔ حرافہ۔۔۔۔ تو عورت نہیں۔۔۔۔ انسان نہیں۔۔۔۔ تو تو۔۔۔۔"

وہ بکتا جھکتا میرے پیچھے لپکا اور میں نے اسے زور کا دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ میں سیڑھیوں کی کنڈی کھولنے میں کامیاب ہو گئی اور دھڑا دھڑ سیڑھیاں اتر کر بازار میں آ گئی۔ وہ میرے پیچھے نہیں آیا۔ پتا نہیں کیوں۔۔۔۔؟ بازار سنسان ہی تھا۔ صرف دودھ دہی کی دکان پر چار چھے مرد کھڑے تھے۔ میں تیز تیز چلتی ان کے پاس سے گزر گئی' جانے کس سمت کو۔۔۔۔ بڑے صاب! میرے جیسی لڑکیوں کی کوئی سمت نہیں ہوتی۔" یہاں تک کہتے کہتے حوالاتن کی آواز بھرا گئی اب وہ آنکھیں پونچھ رہی تھی۔

"پانی۔۔۔۔"

اس نے بغیر کسی طرف دیکھے پانی مانگا۔ مگر کمرہ عدالت میں پانی اگر تھا بھی تو ملزموں کے لیے نہیں تھا۔

عدالت برخاست ہو گئی۔ اس چھوکری نے مجسٹریٹ کو اپنی مسلسل بکواس سے تھکا دیا تھا۔ وہ سب کچھ اسی طرح چھوڑ کر ریٹائرنگ روم میں چلا گیا۔

مقدمات اس کے سامنے ہر روز آتے تھے مگر آج کی حوالاتن چھیمو جیسا کڑکا اور جرأت اس کے تجربے میں نہ آئی تھی۔ البتہ کبھی کبھی بعض مرد ملزم اپنے خلاف فیصلہ سننے کے بعد طیش میں آ کر بولا کرتے تھے۔ احتجاجاً چیختے' دھاڑتے' ہتھکڑیاں بجاتے' مغلظات بکتے۔ سنتریوں سپاہیوں کے ساتھ بندھے باہر کو کھینچے جاتے مگر قانون کے کان بند ہوتے ہیں اور آنکھیں اندھی۔ یہی اس کی بالادستی ہے اور یہی اس کی حرمت۔۔۔۔ پر آج یہ بے حد حسین' بے حیاء عورت ایسے بک رہی ہے جیسے اپنا فیصلہ سن چکی ہو اور دل کا غبار نکالنے پر تلی ہو۔ نوجوان مجسٹریٹ نے چپڑاسی کو اپنے لیے ٹھنڈی بوتل لانے کا حکم دیا اور خود آفس چیئر پر بیٹھ کر دل و دماغ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس عورت کا کیس عجیب تھا۔ وہ اس کی ضمانت منظور کرنے کے لیے خود کو آمادہ پا رہا تھا مگر اس کا ضامن کوئی نہ تھا تاہم اسے عورت کے حوصلے اور صاف گوئی پر حیرت تھی۔ وہ خود کو ان پڑھ کہتی تھی لیکن ان گھڑت نہ تھی۔ لباس اور فیشن کے لحاظ سے وہ ماڈرن اور باشعور تھی۔ تراشیدہ گھنگھریالے سیاہ بالوں کی پی کیپ کا سایہ پیشانی پر' رخساروں پر غازے کا خط کنپٹیوں کی سمت کھنچا ہوا۔ آنکھوں کے بھاری پپوٹوں پر قمیض کے پرنٹ کا ہم رنگ ہلکا ہلکا آئی شیڈ۔ بھرے بھرے ہونٹوں پر گہرے عنابی رنگ کی لپ سٹک۔ کمر پر پھنسی ہوئی قمیض کے اوپر سیاہ ویلوٹ کی جیکٹ جس کی زپ کو نیچے ناف تک کھول رکھا تھا۔ اس کی موجودگی کی لطیف خوشبو سے تمام کمرہ مہک رہا تھا۔ شاید اس نے کوئی بہت بڑھیا سینٹ لگا رکھا تھا۔

مجسٹریٹ سوچ رہا تھا یہ کہاں بیٹھ کر اتنا بنتی سنورتی رہی۔ حوالات کے چوبیس گھنٹے انسان کے حواس گم کرنے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ اصل میں مجھے یہ سوال کرنا چاہیئے تھا اس سے اور سختی سے پوچھنا چاہیے تھا مگر میں دیکھ رہا ہوں میرا رویہ اس کے ساتھ بہت نرم ہے جیسے میں اس کی خوشامد کر رہا ہوں۔۔۔۔ خیر' اب ایسا نہیں کروں گا ویسے میں عورتوں کی قدر کرنے سے زیادہ ان سے ڈرتا ہوں۔ یہ فیشن ایبل عورتیں ایک طرح سے

ہر وقت ہتھیار بند رہتی ہیں۔ یہ لمبے لمبے ناخن' جھپٹیں تو آنکھ نکال لیں۔ پاؤں میں ایڑی والا جوتا۔ آج کل کی "ہیل" بے حد خطرناک معلوم ہوتی ہے۔ چلتی ہیں تو یوں لگتا ہے پتھر سے پتھر ٹکرا رہا ہے۔ نہ جی۔۔۔۔ ان کے زیادہ منہ لگنا اچھا نہیں اور یہ کمبخت چھاتی کھولتی کھولتی دوسرے کا سر کھول دے' کچھ بعید نہیں۔ یہ حوالاتن ہر لحاظ سے خطرناک ہے۔ اس کا پیشہ جرم ہے کوئی بھی کروا لے۔ پلاسٹک کی بنی ہوئی لگتی ہے۔ آگ دکھا کر جو چاہو شکل بنا لو۔

کوکا کولا کی ٹھنڈی بوتل اس کے حلق اور پیٹ کو ٹھنڈا کر چکی تو اس نے کمرہ عدالت میں جھانکا۔ چھیمو وہیں کھڑی تھی۔ دور کہیں مسجد کے لاؤڈ سپیکر سے اللہ اکبر اللہ اکبر کے ساتھ نماز ظہر کا اعلان ہوا۔ چھیمو نے دوپٹہ سر پر لے لیا۔ اس کے پاس کھڑی لیڈی کانسٹیبل نے سگریٹ کے تین چار لمبے لمبے کش لے کے چھیمو کو گھورا۔ ناک بھوں چڑھائی پر چھیمو کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور چہرہ شانت تھا جیسے دعا کے وقت ہوتا ہے۔

مجسٹریٹ تازہ دم ہو کر واپس آگیا۔ ریڈر نے اپنے سامنے پڑے کاغذ اور فائلوں کو الٹا پلٹا۔ کارروائی شروع ہوئی۔ استغاثہ نے سوالات والا پرچہ سامنے پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

"اچھا بی بی۔۔۔۔ اب ذرا ٹھیک سے جواب دینا۔"

چھیمو نے فوراً کہا۔

"مطلب۔۔۔۔ تیری مرضی کا۔۔۔ آخر تو چاہتا کیا ہے مجھ سے۔ دیکھ' میں اپنی مرضی کی آدمی ہوں۔"

"تو یہ بتا۔۔۔۔ تو طارق وسیم کے ساتھ کتنے دن رہی اور کہاں کہاں رہی۔"

"طارق وسیم۔۔۔۔؟ کون؟"

"وہی جس کے باپ کا تو سر پھوڑ کر دوڑی ہے۔"

"کیا کہا؟۔۔۔۔ کیا کہا؟ اس کا باپ۔ وہ کمینہ ریاکار بڈھا۔ وہ اس فرشتے کا باپ ہو ہی نہیں سکتا۔ کیا نام بتایا۔ طارق وسیم۔ عشق' نام اور ذات سے واقف نہیں ہوتا۔ میں نے تمہیں پہلے ہی بتایا نا! جہاں تک میرا خیال ہے اس کا نام طارق وسیم نہیں تھا۔ حسن اور

خوبی کو کوئی نام بھی دے دو لیکن وہ طارق وسیم نہیں تھا۔"

"تم جھوٹ بولتی ہو۔۔۔۔"

"نہیں۔۔۔۔"

"میں پوچھتا ہوں وہ کون تھا؟"

"شیر تھا' ٹیپو تھا۔۔۔۔ پنوں نہیں تھا۔۔۔۔ میں شیریں ہوں۔ وہ فرہاد تھا۔" چھیمو نے سینہ کوبی شروع کر دی۔

"میرا فرہاد۔۔۔۔" وہ چلائی۔۔۔۔ "فرہاد! شیریں پیاسی ہے۔"

اور اس نے اپنی دونوں باہیں فضا میں پھیلا دیں۔

"ڈرامہ مت کرو۔" مجسٹریٹ نے مجمع کی طرف دیکھتے ہوئے دھاڑ کر حکم دیا۔

چند ثانیے کے لیے سکوت چھا گیا۔

چھیمو نے اپنے بکھرے ہوئے حواس سمیٹتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"وہ مجھے دیر سویر ساتھ لیے لیے پھرتا رہتا تھا۔ کبھی کہیں کبھی کہیں۔ ہم کام کرتے تھے۔ میں' میں مٹی کی بنی چھیاں طلب گار رہتی تھی کہ وہ مجھے چھوئے' چھیڑے۔ پر وہ میری سوالیہ نظروں بھری آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر کہتا۔

"اونھوں ہوں۔۔۔ اچھے بچے ایسے نہیں کرتے۔۔۔۔ چلو بہت کام باقی ہے۔"

"ہاں۔۔۔۔ اب آئی نا راستے پر۔۔۔۔" کمرہ عدالت میں کھڑے لوگوں میں سے کسی نے بلند آواز میں کہا۔ دوسرے نے قدرے دھیمے رہ کر جواب دیا۔

"جی ہاں۔۔۔۔ جی ہاں۔۔۔۔ سیاسی چھوکرے اس قسم کی ہیرئیوں سے کام لیتے ہیں جی۔ ایسے ایسے کہ عقل دنگ رہ جائے اور یہ ٹکے ٹکے کی چھوکریاں سسیاں' سوہنیاں' شیریاں اور ہیریں بننے کے خیال میں استعمال ہوتی ہیں۔ سازشوں میں شریک ہوتی ہیں۔ خطرناک سے خطرناک کام کر گزرتی ہیں۔"

کہنے والے نے آنکھیں چھیمو پر گاڑ رکھی تھیں۔ لگتا تھا کہ استغاثہ پارٹی سے اس کا قریبی تعلق ہے۔ استغاثہ کے بڑے گواہ کے گرد لوگ میمنہ میسرہ کی شکل میں جمع تھے۔

منڈی اور مروڑی ہوئی مونچھوں والے سپید پوش جنھیں اپنی پوزیشن پر ناز تھا' کھرا کاروبار کرنے والے گرگے جن کی آنکھیں' آنکھیں نہیں گدھ تھیں۔ کھچڑی چنگی داڑھی والے ملا جو اپنی مردہ آنکھوں میں کاجل بھر کر کھڑے مسلسل پان چباتے بالکل بکرے لگتے تھے۔ بارڈر ایریا سے ملحق بااثر لوگ کوئی چودھری صاحب' کوئی بٹ صاحب' کوئی شیخ صاحب جانے کون کون صاحب۔ ان صاحبوں کے چہروں پر خوش خوراکی کی لالیاں بکھری تھیں۔ وہ گفتگو کرتے ہوئے ایک دوسرے کا ہاتھ خفیہ انداز سے دباتے اور پھر آنکھیں میچ میچ کر مسکراتے۔ ہونٹ کاٹتے۔ ان میں جوان بھی تھے۔ ادھیڑ بھی اور ادھیڑ عمر سے گزرے ہوئے بھی۔ شاید چھیمو ان سب کی ملزم تھی۔ ان سب کی دین دار تھی----

چھیمو نے جب اپنے ان حالات پر روشنی ڈالی جو عدالت اور اس میں کھڑے لوگوں کو درکار تھے تو یہ معزز شہری خوشی سے بھن بھن کرنے لگے۔

"ہاں جی ہاں---- عدالت کے کٹہرے میں بڑوں بڑوں کا پتا پانی ہو جاتا ہے۔ بھلا کوئی اس سے پوچھے' اس رنگ روپ اور جوانی کو طارق وسیم جیسے زیر زمین چھوکروں کے حوالے کرنے سے کیا حاصل؟ ہیروں سے تلنے والا جثہ مٹی میں رول دیا۔"

"چپ رو یار---- انسانی انجن کو پٹڑی سے اترتے دیر نہیں لگتی۔" مجمع میں سے کسی نے کہا۔

"تم لکھ پڑھ سکتی ہو۔" وکیل نے پوچھا۔

"بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔ ویسے ان پڑھ ہوں۔"

"اگر تم ان پڑھ ہو تو طارق وسیم کے ساتھ کیسے وابستہ ہوئیں اور خفیہ خطوط تقسیم کرنے میں کس طرح ملوث ہوئیں؟"

"میں نے کہا میں ملوث نہیں ہوئی اور نہ میں اس کے بارے میں زیادہ جانتی ہوں۔ وہ مجھے ایک محفل میں ملا۔ تم جانتے ہو اچھی صورت کھینچتی ہے۔ حسینوں کے اپنے ہی داؤ پیچ ہوتے ہیں۔"

"تمہیں پتا ہے تم تخریب کاری میں ملوث ہو گئی ہو۔" قریب کھڑے ایک وکیل نے

چھیمو کو سرگوشی میں باور کرایا۔

"حرام کاری تو میرا پیشہ رہا ہے یہ تخریب کاری کہاں سے آ گئی۔ تم جو بھی کاری کا کہو۔ کالے کوٹ جی! میرے نزدیک حرام کاری سے بڑا گناہ کوئی نہیں۔ اور میں حیران ہوں کہ حرام کاری کرتے عمر گزر گئی۔ پکڑی بھی گئی تو چھوڑ دی گئی۔" اس نے بیان جاری رکھا۔

"اور وہ بڈھا جسے تم اس فرشتے کا باپ کہتے ہو نہ جانے کیسے میرے کمرے میں آ گیا اور لگا مجھ سے دست درازی کرنے۔ میں نے بہت کہا ہٹ ہٹ۔۔۔ پر وہ باز نہ آیا۔ میں نے اس کے سر پر ملا گوری کا لیمپ توڑ دیا اور بھاگ آئی۔ کھلی سڑک سے تمھارے سپاہی مجھے پکڑ لائے۔ اب تم کہتے ہو میں تخریب کاری کرتی ہوں تو ٹھیک ہے۔ تم لوگوں کی طرح حرام خوری نہیں کرتی۔ کام کر کے کماتی ہوں تو کھاتی ہوں۔"

"کیا مطلب۔۔۔۔؟"

"وہ رقعے' وہ خط۔ مطلب ہے وہ چھپے ہوئے کاغذ۔ جن میں حکومت کے خلاف مواد تھا۔۔۔" وکیل استغاثہ نے ہر ہر لفظ ٹھہر ٹھہر کر ادا کیا۔ چھیمو ایسے لگتا تھا قطعی لا تعلق ہے استغاثہ نے دوبارہ سوال کیا۔

"اس کے ساتھی کون کون ہیں؟ تمھارے علاوہ؟"

"پھر وہی۔۔۔۔" چھیمو چڑ گئی۔۔۔۔ "جو بھی فرد لگانا ہے لگاؤ بڑے صاب! مجھے حوالات سے نکالو۔ جیل میں ڈالو' جہنم میں ڈالو۔ پر اس عالم برزخ سے نجات دلاؤ۔ میرے لیے اندر باہر ایک سی قید ہے۔ پر حوالات نے مجھے بوند سا بنا دیا ہے۔ اب گری کہ اب گری۔ بے یقینی' بے چینی۔ ربا! کوئی حوالاتی نہ بنے۔۔۔۔"

"ہم سب حوالاتی ہیں بی بی!" حاضرین میں سے کسی نے اونچی آواز میں کہا۔

"کون ہے یہ۔۔۔۔؟" پیشکار چوکنا ہو گیا۔ مجسٹریٹ نے گردن گھما کر جائزہ لیا۔ مجمع کی بھنبھناہٹ سنسناہٹ میں بدل گئی جیسے سانپ شوک کر رہ گیا ہو۔

"یہاں تمھارا کوئی ساتھی ہے؟"

"تم خود کہتے ہو میں بری عورت ہوں۔ پھر بھرے مجمعے میں میرے ساتھ کا اعتراف کون

کرے گا؟ میں ہی ہوں یا میرا خدا۔ کیا تمہیں خدا کی ضامنی کا اعتبار ہے۔" وہ ہاتھ ہوا میں لہرا کر ہنسی "نہیں نہیں---- ویسے وہ کہتا ہے میں ڈھیل دیتا ہوں---- اس کی تھوڑی تھوڑی ڈھیل میں اچھے اچھوں کی پتنگیں کٹ جاتی ہیں۔ بس جی اتنی سی بات ہے---- اور مجھے کچھ نہیں کہنا۔"

کچھ دیر بعد مجسٹریٹ نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے چھیمو کو ایک ہفتے کے ریمانڈ پر سپیشل پولیس کے حوالے کر دیا۔

جب چھیمو کو لیڈی کانسٹیبل حوالات کی لاری میں بٹھا کر اس کے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے سیٹ ہو کر بیٹھ چکی تو چھیمو نے باقی گرفتاروں پر ایک نظر دوڑائی اور کڑک کر پوچھا:

"اب مجھے کہاں لے جایا جا رہا ہے؟"

"میری ملکہ! حوالات سچ مچ تیرے لائق نہیں۔ تجھے شاہی قلعہ میں ہونا چاہیئے اور اب تو وہیں جا رہی ہے----"

چھیمو کی نگاہیں لاری کی بالشت بھر تنگ جالیوں کو پار کر گئیں۔ نیلا شانت آسمان' چیلیں' گدھ' کوے اور ایک ننھی چڑیا---- پرواز کی کوشش میں---- لاری چل رہی تھی اور چھیمو آنے والے دنوں کے لیے قطعی مشوش نہیں تھی۔

(1986ء)

☆ ناشر : ہم عمر

ooooo

حزب اللہ

خبر ملی ہے کہ افغانستان نے طورخم سے کچھ ہی فاصلے پر' زمین سے زمین پر' مار کرنے والے میزائل نصب کر دیے ہیں۔

طورخم پشاور سے زیادہ دور نہیں۔ درہ خیبر کے قریب سے گزریے۔ چند میل دور طورخم ہے۔ یہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان آنے جانے والوں کے لیے آفیشل چوکی ہے۔ ایک سرمئی سڑک سرحد پر لگے گیٹ کو پار کرتے ہی افغانی سڑک بن جاتی ہے۔ اس کا رنگ سرمیلا سیاہ' ویسا ہی ہے جیسا پاکستان کے حصے میں ہے۔ اس میں پتھر' بجری' تارکول لگا ہے جیسے ادھر ہماری طرف۔ پہاڑیاں' ٹیلے' جھاڑیاں' پودے اُدھر بھی ہیں اِدھر بھی البتہ ایک فرق فوری توجہ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ ادھر چاند تارے والا سبز پرچم لہرا رہا ہے۔ اس کے آس پاس مستعد' چاک و چوبند محافظین' صاف ستھری خوب استری کی ہوئی وردیاں پہنے اٹنشن کھڑے ہیں۔ ان کی وردیاں کہتی ہیں۔ ہم پاکستانی ہیں۔ اُدھر گیٹ کے پار کھڑے محافظین کی وردیاں ان کے افغانی ہونے کی گواہی دیتی ہیں۔ ان کے جھنڈے کا رنگ ہلکا سبز' لال اور گہرا سبز ہے' درمیان میں لال رنگ سے ابھرتی مسجد۔ دونوں طرف کے جوان بظاہر انسان ہیں۔ ان کے ناک نقشے اس خطے کے باشندے ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ شاید نسل بھی ایک ہی ہو لیکن آج کل نظریاتی تفریق کی وجہ سے قومیتوں کا تعین کرنے کا رواج ہے لہٰذا وہ تمھاری پالی یہ ہماری پالی۔ پھر پالیوں میں طبقات۔ اور طبقات میں تفرقے۔ یہ محافظین ایک دوسرے سے کبھی کبھی بات چیت بھی کر لیتے ہیں۔ ایک' دوسرے کو دیکھ کر مسکراتا ہے تو دوسرا بھی مسکرا دیتا ہے۔ دعا سلام' خیر خیریت پوچھنے

کی انسانی رسم بھی جاری ہے۔

"کیا حال ہے یار؟" پشتو میں سوال آتا ہے۔

"بیٹے کو نمونیا ہو گیا ہے۔" پشتو ہی میں جواب جاتا ہے۔

اور تبھی سینئر محافظ کڑک کر بکواس بند کرنے کا حکم دیتا ہے۔

"خبردار ----"

دونوں طرف کے محافظین سیدھے ہو کر' "خبردار" ہو جاتے ہیں اور اپنی اپنی طرف کے جھنڈے کے قریب سرکنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پاکستانی محافظ جزب اللہ کا بیٹا چند روز بیمار رہ کر مر گیا۔ جزب اللہ گاؤں نہیں جا سکا۔ اصولی طور پر اسے چھٹی نہیں مل سکتی تھی کیوں کہ دو ہفتے پہلے وہ ایک ماہ کی چھٹی گزار کر لوٹا تھا۔ دوسرے اس نے بچے کی بیماری کو خاص اہمیت نہ دی اور اب اسے یقین ہو چلا تھا کہ ضرور اس کی بیوقوف بیوی کی غفلت کی وجہ سے بچے کو نمونیا ہوا اور موت آئی۔ یوں تو موت و حیات بے شک رب کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جب اور جسے چاہے اٹھا لے۔ عمر کی کوئی قید نہیں۔ جزب اللہ نے اپنے آپ کو سمجھا لیا۔ رب سب سے شاطر شطرنجی ہے۔ انسان' گھوڑے' پیادے' فیلر' وزیر' بادشاہ کچھ بھی نہیں۔ وہ جس کو چاہے مات دے۔ جب چاہے گھات میں لے۔ تاہم لڑکے کو اتنی جلدی مرنا نہیں چاہئے تھا۔ میرے ماں باپ بہت روئے پیٹے ہوں گے۔ پوتے کا شوق انہیں کو زیادہ تھا۔ جزب اللہ تجزیہ کرتا رہا۔

خود جزب اللہ کو بچے کے خدوخال تک یاد نہ تھے۔ وہ جوان تھا اور جوان ایسی باتوں میں نہیں پڑتا۔ پھر بھی بیٹے کی موت کی خبر سے متفق ہونے کے بعد وہ ایک ہی بات سوچے چلا جا رہا تھا کہ کب اسے چھٹی ملے اور کب وہ گھر جا کر بیوی کو دوبارہ حاملہ کرے اور کب بیوی ایک اور بیٹا جنے۔ بات مہینوں سے سالوں پر پڑتی دکھائی دیتی تھی۔ وہ غصے کا زہر اپنی بیوی زلیخا کے تصور پر تھوک رہا تھا۔ غصہ اس میں عجب حیوانی اور شہوانی قوت کو ابھار رہا تھا۔ زلیخا اس کے پاس ہوتی تو وہ اسے بھنبھوڑ کر رکھ دیتا۔

اسی رات جب وہ سجدے میں گرا زلیخا سے تصوراتی ملاپ کے مزے لے رہا تھا۔ اردگرد کی پہاڑیوں پر گولا بارود پھٹنے کی گھن گرج سنائی دی۔ تصور کا سلسلہ ٹوٹ گیا' تو اس نے سلام پھیرا۔ جلدی جلدی دعا ختم کی۔ اس کا نمازی ساتھی کہہ رہا تھا۔

"آج بڑا حملہ ہوا لگتا ہے۔"

"ہاں۔۔۔۔"

اس نے مختصر جواب دیا۔

"یہاں سے خاصی دور' البتہ۔۔۔۔"

"اچھا۔۔۔۔" وہ لاتعلق تھا۔

"دور ہو یا نزدیک موت' موت ہی ہے۔ اور تباہی تباہی۔"

ساتھی نے اظہار خیال کیا۔

"ہاں۔۔۔۔"

اب جزب اللہ نے موت کے نام پر اپنے مرحوم بیٹے کو یاد کر کے غمگین ہونے کی کوشش کی مگر اسے رونے کا ٹھوس جواز نہیں مل رہا تھا۔ کوئی تصویر مکمل نہیں ہو رہی تھی۔ سوائے رنگ برنگے چیتھڑوں کی ڈھیری میں خفیف لرزش کے' زندگی اور حرکت کی کوئی دلیل نہیں مل رہی تھی۔ پھر جب ماں اور گھر کی دوسری عورتوں نے چیتھڑوں کی یہ ڈھیری اس کی گود میں رکھ دی تو زچگی کی "چھاند" نے اسے بیزار کر دیا۔ اس بیزاری میں نرم گرم احساس در آیا۔ جس نے اس کے پاؤں کے تلووں تک آگاہی کی جھرجھری لہرا دی۔ لہو کی گردش تیز ہو گئی۔ کان سائیں سائیں بولے۔ "تو باپ بن گیا۔"

غرور اور سرمستی سے اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس روز اس نے زلیخا کو نئے انداز میں دریافت کیا۔ سترہ سالہ کمزور' کم عقل لڑکی ویسے کچھ بھی نہ تھی۔

گولا بارود کے نتیجے میں ہونے والی تباہی پر وہ کسی اپنے حوالے سے غمزدہ ہونے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔

"لوگ مر رہے ہیں' جوان مر رہے ہیں۔ اناللہ وانا علیہ راجعون۔"

اس کے ساتھی کی آواز میں رقت تھی جس پر جزب اللہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ رینجرز میں اتنی دیر سروس کرنے کے بعد ایک سینئر اور تجربہ کار رینجر کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اس طرح افسردہ ہو۔ افواہوں کے مطابق "مجاہدین" جو پاکستانی علاقے سے لڑ رہے ہیں۔ ان کا پلہ ہر حال میں بھاری بتایا جاتا ہے وہ اسلام کی جنگ لڑ رہے ہیں تو پھر افسوس کس بات کا۔ افغانستان والوں پر البتہ افسوس کرنا چاہیے جو اسلام کے دائرے سے خارج

ہونے پر کاربند ہیں۔
بہت دیر تک چپ رہنے کے بعد حزب اللہ نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔
"تم نے جو ابھی انا للہ پڑھا۔۔۔۔ تو کس لیے؟"
"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔"
ساتھی نے استفسار کیا۔
"مگر میں افغانیوں پر لاحول پڑھتا ہوں"
اس کا ساتھی بلا جواب دیئے چلا گیا۔
اگلی صبح حزب اللہ کو ڈیوٹی پر جانا تھا۔ لہٰذا وہ ہر آواز اور ہر خیال کو جھٹک کر سو گیا۔ گہری نیند میں نہ تو اسے کوئی خواب آیا اور نہ ہی کوئی آواز سنائی دی۔ چار بجے صبح خود بخود آنکھ کھل گئی۔ اسے اپنا آپ ہلکا پھلکا اور تازہ دم لگا۔ اسے یقین تھا کہ افغان مہاجرین رات کسی نہ کسی چوکی پر قبضہ کر چکے ہوں گے۔ آج حسب معمول نشریاتی ادارے فتح و نصرت کی خبریں سنائیں گے اور ممکن ہے ٹی وی والے حملے اور ایڈوانس کرنے کی رپورٹ بھی دکھا دیں۔ وہ نماز فجر ادا کرتے ہوئے یہ سب باتیں سوچ رہا تھا۔ تبھی اس کے ساتھیوں نے باہم ایک دوسرے کو اطلاع دی کہ دونوں طرف نقصان ہوا ہے ممکن ہے اموات ادھر زیادہ ہوئی ہوں۔ مہاجرین کی خیمہ بستیاں ادھر ہی ہیں۔ اس قسم کی قیاس آرائیاں ہوتی ہی رہتی تھیں کیوں کہ ابلاغ عامہ کا کوئی وسیلہ بھی سرحدی چوکیوں پر فراہم نہیں کیا جاتا۔
حزب اللہ ڈیوٹی پر کھڑا تھا۔ پو پھٹ رہی تھی۔ تبھی ایک بنفشی کرن پہاڑیوں کی چوٹی سے پھسلتی' درختوں کی کونپلوں کو چومتی' دو طرفہ لہراتے جھنڈوں سے کھیلتی محافظین کے چہروں پر پھیل گئی۔ حزب اللہ نے ایک نگاہ خشمگیں دوسری طرف ڈالی اور رخ پھیر لیا۔ اسے آج اس طرف دیکھنا تک گوارا نہ تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک ناراض تھا اُدھر والوں سے' اور تبھی ایک سرگوشی لوہے کے گیٹ کی پروا کیے بغیر صبح کی سرد ہوا کے ساتھ سرسراتی اس کے کانوں سے ٹکرائی۔
"کیا حال ہے تمھارے بیٹے کا؟ خبر آئی؟"
حزب اللہ کا جی تو چاہا کہ چلا کر کہے۔۔۔۔ بیٹا گیا بھاڑ میں رذیلو۔ مگر اس نے روایتی

مہذب انداز میں کہا:

"مر گیا۔۔۔۔"

"بہت افسوس ہوا یار۔ میں نے دل سے دعا کی تھی اس کے لیے۔"

سرسراہٹ میں ہمدردی تھی۔ جزب اللہ کا رخ بے خیالی میں افغانستان کی طرف مڑ سا گیا تھا مگر اس نے بہ کوشش پاکستان کی طرف پھیر لیا۔ صوبے دار میجر اس کے قریب سے گزرا تو جزب اللہ کا پورا وجود صحیح سمت میں تھا۔ ہوشیار اور ذمہ دار۔ جھنڈے کے پول کی طرح جس کے پیر کسی مستری نے سیمنٹ بجری کے مصالحے میں مضبوطی سے گاڑ کر اوپر سے نیرو کر دیا ہو۔

"خوب سوئے؟"

صوبیدار میجر نے چلتے چلتے اخلاقیات کا مظاہرہ کیا۔ یہ جزب اللہ کے سیلوٹ کا جواب تھا۔

"جی سر! شکریہ سر"

دوسرے جوانوں نے اس پر رشک بھری مسکراہٹ کی بارش کر دی تو وہ بھی مسکرایا۔ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی شاباشی فوجی زندگی میں ننھے ننھے رشک اور منی منی رقابتوں کو ابھارتی پچھاڑتی' مائل بہ روانی رکھتی ہے۔۔۔۔ صوبے دار کا "خوب سوئے" والا سوال جزب اللہ کو دن بھر سرشار رکھنے کو کافی تھا۔ اس سرشاری میں اسے بیوی بہت یاد آئی۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر' ٹیلوں کی پتلی پتلی پگڈنڈیوں پر زلیخا ہی زلیخا تھی۔ چھڑی پکڑے' بکریوں کے پیچھے قلانچیں بھرتی زلیخا' جسے جزب اللہ کے والدین نے چھ ہزار روپے خرچ کر کے حاصل کیا تھا تاکہ قبیلے کی لڑکی آ کر ان کے بیٹے کا گھر بسائے اور ان کے لیے صحیح النسل پوتے پوتیاں پیدا کرے۔ ویسے بھی علاقے میں عام عورت کے دام چڑھ چکے تھے اور یہ تو قبیلے کی عورت تھی اس کی ماموں زاد۔ چھ ہزار روپے خاصی تنگی ترشی کے بعد جمع ہو پائے تھے۔ قیمت کے سلسلے میں ماموں نے کوئی رو رعایت نہ برتی تھی۔

سرحدوں پر تعینات جوان ہمہ وقت جنگ و جدل کے جذبات اور افواہوں کی سرگوشیوں میں رہتے ہیں۔ پڑھنے کے نام' نماز اور قرآن پڑھتے ہیں' سننے کے نام' اپنے حق میں مثبت افواہیں سنتے ہیں اور دیکھنے کو دشمن کی طرف نفرت سے دیکھتے ہیں' تخیل کے نام اپنے گھر والوں' گلیوں' محلوں کے تصور باندھتے ہیں' یاد کرتے ہیں۔ ان سب اعمال پر کوئی پابندی

نہیں بلکہ ان پر باقاعدگی سے عمل کرنے سے جوانوں کا مورال بلند ہوتا ہے۔ جزب اللہ ہر لحاظ سے مورال بلند رکھے ہوئے تھا۔ یہ نہ صرف اس کا قومی فریضہ تھا بلکہ بحیثیت فرد بھی اسی میں سرخروئی تھی۔

ان چوکیوں پر خبریں' افسر حضرات کو' وائرلیس کے ذریعے پہنچتی ہیں اور وہ اپنی صوابدید اور موقع و محل کے مطابق ردو بدل کر کے ماتحتوں تک کو منتقل کر دیتے ہیں----
"کیوں؟---- کیسے؟"---- کرنے والا شخص اس ماحول میں نہیں چل سکتا۔

جزب اللہ آج تمام وقت ادھر سے گریز کیے اپنا فرض انجام دیتا رہا۔ بس اس کا اپنا ہی جی نہیں چاہتا تھا کہ ادھر نفرت یا مروت کی کوئی نگاہ ڈالی جائے۔ اس نے دل میں ایک جنگ ٹھان لی تھی۔ اب دشمنی ہے تو کھلے عام دشمنی ہے۔ وہ مسلسل ان کے بارے میں تف تف کہہ رہا تھا۔ کیا سوجھی کہ بیٹھے بٹھائے دائرہ اسلام سے خارج ہونے پر کمر کس لی---- اور شدھ مسلمانوں کو دھکیل' پاکستان بھیج دیا۔ سنا ہے پاکستان کی آبادی زور شور سے بڑھ رہی ہے۔ شہروں میں بھیڑ بھر گئی ہے۔ لوگ مرنے مارنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ آئے دن دھماکے ہوتے ہیں۔ اسلحہ عام ہے۔ کسی کو دشمن گردان کر قتل کرنا مشکل نہیں رہا۔ سب کچھ مہنگا ہے۔ انسان سستا ہے۔ یہ اور اس قسم کی واہیات باتیں جزب اللہ کے ذہن میں گردش کرتی رہیں جن پر زلیخا کا سایہ برابر پڑتا رہا۔ ڈیوٹی پر کھڑا وہ دشمن کی طرف نفرت سے دیکھتے دیکھتے اپنے اندر دیکھنے لگتا تھا۔ یہ بھی سنا ہے شہروں کے گنجان علاقوں میں بم پھٹتے ہیں۔ یہ بم شہروں تک کیسے جاتے ہیں کچھ پتا نہیں چلتا۔ ہم یہاں آنکھیں کھولے کھڑے' نہایت محتاط تکتے رہتے ہیں۔ مسافروں سے بھری بسیں اور سامان سے لدے ٹرکوں کے بیچ تک ہماری نظریں نہیں جا سکتیں اور نہ ہی میری یا کسی اور ساتھی کی ایسی حیثیت ہے ہمارے لیے تو بس حکم ہے---- جا---- ٹکرا---- وقت پڑے تو مر جا---- باقی باتیں---؟ کچھ نہیں۔

جزب اللہ کو رفتہ رفتہ محسوس ہونے لگا جیسے وہ کل کا گھوڑا ہو یا کلاشنکوف کے فیتے میں جڑی ایک گولی۔ بٹن دبے گا تو اسے پتا بھی نہ چلے گا کہ وہ کب چل گئی۔ کس کو لگی اور خالی ہو کر کہاں گری؟----

اب صوبیدار میجر کے سوال کی سرشاری اور نیند بھر سونے کا اثر زائل سا ہو چلا تھا۔ یا

اپنے اندر جھانکنے اور جھانکتے چلے جانے کا نتیجہ تھا کہ اس پر پژمردگی' افسردگی اور یبوست چھا گئی۔ وہ اپنے تصور کو بار بار زلیخا پر مرکوز کر کے لطف اندوز ہو ہو کر تنگ آ چکا تھا۔ اسے اپنے ساتھیوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ کیا کہتے تھے' اسے کیا؟ سہ پہر ہونے تک اسے کپکپی کے ساتھ بخار آ گیا۔ وہ بخار کی غنودگی میں بڑبڑاتا' بک بک کرتا رہا۔

تیسرے روز اس کی حالت کے پیش نظر جزب اللہ کو قریبی ملٹری ہسپتال بھیج دیا گیا۔ طبیعت ٹھیک ہوئی تو کرنل صاحب کے بنگلے پر بطور اردلی اس کی تعیناتی ہوئی۔ اس کو سرحدی ڈیوٹی سے بدلنے کی وجوہات میں ایک غالب وجہ یہ تھی کہ وہ بعض اوقات ورے کھڑے محافظوں سے التفات بڑھانے کے لیے بے چین نظر آتا تھا۔

کرنل صاحب کے بنگلے میں اسے خاصا سکون ملا۔ بے فکری اور فراغت میسر آئی۔ ریڈیو' ٹی وی' وڈیو پر فلمیں' کیسٹ پلیئر' شہر' شاپنگ' شرفاء کے سہل انداز۔ یہ سب چیزیں مل کر اس کے لیے اطمینان کا باعث بنیں۔ حیران کن سائنسی ایجادات نے جزب اللہ کو کئی دن تک اپنی طرف یوں مبذول کیے رکھا جیسے وہ روبوٹ ہو جسے ریموٹ کنٹرول سے فیڈ بیک مل رہا ہو۔ اسے ایسے لگ رہا تھا جیسے اس کے اندر کا وحشی جنگلی مرد ہولے ہولے تہذیب کا نیا رنگ پکڑ رہا ہو۔ اب زلیخا کے عورت پن پر رومان کا مہین پردہ پڑنے لگا تھا اسے اپنے گرد پھیلی دنیا کی وسعت اور رنگا رنگی کا اندازہ ہو رہا تھا۔

اس دوران جزب اللہ کرنل صاحب کی اجازت سے دو تین بار گاؤں ہو آیا۔ اس کی بیوی اور ماں بچے کو یاد کر کر کے اس کے سوئے ہوئے جذبات کو گودنے کی کوشش کرتی رہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اس کا بیٹا جس کا نام انھوں نے غازی امان اللہ رکھا تھا ایسے مسکراتا تھا۔ اس طرح آنکھیں کھول کر روشنی کو تکتا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں تو جزب اللہ تم پر ہی تھے آنکھیں اور رنگ زلیخا کا۔۔۔۔ امان اللہ زندہ رہتا تو جزب اللہ وہ تمھاری طرح غازی بنتا' کافروں کے خلاف جہاد کرتا اور اپنے ایمان کو مکمل کرتا۔۔۔۔ماں نے پھر اس کا ماتھا چوم کر تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔

"اللہ جوڑی سلامت رکھے۔ جوان ہو' بچوں کا کیا ہے ہنستے کھیلتے آ جاتے ہیں۔ تم سلامت رہو۔"

دیہات کے سکول کی کچی پکی آٹھ جماعتیں پڑھنے کے بعد اور عملی زندگی کے نشیب و

فراز کو دیکھتے ہوئے جزب اللہ یہ نتیجہ اخذ کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھتا تھا کہ وہ غازی نہیں تاہم اس نے غازی غازی پکارتی ماں کو منع نہیں کیا۔ مائیں بچوں کے متعلق بڑی بڑی خوش فہمیوں میں مبتلا ہوتی ہیں۔ ان کی خوشی کا پر تو یہی ہے۔ اب جو نقشہ غازی امان اللہ کا اس کے ذہن نشین ہوا تو یہ بھی دو ماؤں کی یک جہت خوشی تھی۔ بے ضرر اور خالص۔

یہ نقشہ اب اس کے ذہن میں تیزی سے بڑھنے لگا۔ دبلا پتلا' گورا چٹا' کھڑے کھڑے کان۔ اس جتنا قد بت۔ جزب اللہ نے خیالوں میں بیٹے کو اپنے ساتھ کندھے سے کندھا ملائے کئی بار دیکھا۔ غازی امان اللہ زندہ رہتا' جوان ہو جاتا تو ایسا ہی ہوتا جیسا میں سوچتا ہوں۔

دو تین مرتبہ گھر ہو آنے کے باوجود اس کے تعاقب میں کوئی خوشخبری نہیں آ رہی تھی۔ شبہات سر اٹھاتے تھے۔ ماں کی بات یاد آتی تھی۔ "اللہ جوڑی سلامت رکھے۔۔۔۔ بچے بہت۔۔۔۔" مگر کہاں تھے؟ جزب اللہ کو کچھ ہو گیا تھا یا زلیخا اس قابل نہ رہی تھی۔ اب واہموں نے اس کا دل دیکھ لیا تھا جو بیٹھتے اٹھتے ساتھ رہتے۔ تنگ آ کر جزب اللہ' زلیخا کو ساتھ لے آیا۔ یہاں علاج معالجے کی سہولت تھی' تنہائی دور ہو گئی۔ کوارٹر بھی آباد ہو گیا۔

کرنل صاحب مع بیگم بچے باہر جاتے تو گھر کا انچارج جزب اللہ ہی ہوتا۔ وہ اس پر بہت بھروسا کرتے تھے۔

آج دو دن سے بیگم بچے گھر پر نہ تھے۔ خاندان کے افراد اور ذاتی ملازم کسی شادی میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ جزب اللہ زلیخا کو بنگلے میں لے آیا۔ دونوں نے خوب ٹی وی دیکھا' وی سی آر پر فلمیں چلائیں۔ پسند کے گانے بار بار سنے۔ فارمولا فلمیں' عشقیہ گیت' ہیرو' ہیروئن کی اچھل کود اور میل ملاپ ان کے جوان جذبوں کو دہکائے رکھنے کے لیے کافی تھا۔ زلیخا جذباتی مناظر دیکھ کر بعض اوقات پھس پھس کر کے رو دیتی۔ جزب اللہ ڈانٹ کر کہتا۔

"کفران نعمت نہ کر بدبخت۔ یہ سب ایکٹنگ ہے۔ جھوٹ ہوتا ہے یہ۔۔۔۔ حقیقت نہیں۔ یا کوئی اور یاد آتا ہے۔۔۔۔؟"

"تف ہے تجھ پر۔۔۔۔" زلیخا پھنکار کر جواب دیتی۔

"تو روتی کیوں ہے؟ جھوٹی باتوں پر منحوس۔۔۔۔!"

لیکن وہ ٹی وی کے پروگرام شروع سے آخر تک دیکھنے سے باز نہ آتے۔ یہاں تک کہ "سایہ خدائے ذوالجلال" کے بعد پھڑک سے نشریات ہی ختم ہو جاتیں۔ خبرنامے میں انھیں قطعی دلچسپی نہ تھی۔ اکثر خبریں ان کے سر سے گزر جاتی تھیں۔ کیوں کہ ان میں ان کے لیے کوئی خبر نہ ہوتی تھی۔ سیاسیات' دنیا کے واقعات اور حادثات سے انھیں کیا لینا دینا۔

آج بھی وہ حسب معمول خبروں کو سر سے گزار رہے تھے کہ اچانک ٹی وی سکرین پر حیران و ششدر کھڑے لڑکے نے ان کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ کمنٹیٹر بتا رہا تھا۔ آج افغان مجاہدین نے ایک رُوسی مگ طیارہ مار گرایا۔ طیارے کا پائلٹ بیل آؤٹ ہوگیا۔ اب وہ حراست میں ہے۔

رنگین سکرین پر زیر حراست کمسن پائلٹ جلتے جہاز سے کچھ ہی فاصلے پر چپ چاپ کھڑا حسرت اور بے بسی سے تک رہا تھا۔ اس کے خجل طفلانہ انداز سے یوں لگتا تھا جیسے کھیلتے کھیلتے اس کی گیند ہمسائے کی کوٹھی کی باڑ پھلانگ کر لان میں آگری ہو اور چوکیدار نے اس کی گیند کو توڑ پھوڑ کر پھینک دیا ہو۔ اور شرارت کی پاداش میں وہ پکڑا گیا ہو۔ زلیخا اور جزب اللہ خاموشی سے اس منظر کو دیکھتے رہے۔ پھر ایک گھٹی گھٹی سی سسکی کے ساتھ زلیخا نے اپنا سر جزب اللہ کے کندھے پر رکھ دیا۔ وہ ڈر رہی تھی کہ جزب اللہ اسے پھر ڈانٹے گا۔۔۔ "منحوس مت رویا کر جھوٹی باتوں پر۔۔۔" لیکن جزب اللہ نے آہستگی سے اس کے گالوں پر آئے ہوئے آنسو پونچھ دیے۔ زلیخا نے حیرت سے شوہر کی طرف دیکھا۔۔۔ ٹپ ٹپ دو بوندیں زلیخا کے چہرے پر گریں اور اُس نے سکرین کی طرف اُنگلی سے اشارہ کرتے ہوئے جزب اللہ کو متوجہ کیا۔ "وہ۔۔۔۔ وہ میرا غازی میرا بچہ۔۔۔ میرا امان اللہ"

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ ہاں زلیخا! اپنا امان اللہ۔" اور جزب اللہ نے زلیخا کا سر دوبارہ اپنے سینے پر رکھ لیا۔

OOOOO

کوما۔۔۔۔ آدم

"دیبا! بے وفا!۔۔۔۔ تجھ پر دنیا تھوکے اور تجھے کتے چاٹیں۔۔۔۔ لوگو! لوٹ کر لے گئی مجھے۔ کل کی چھوکری۔ کمینی۔۔۔۔ مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر گئی۔"

کوما گڑگڑ کر گالیاں بک رہا تھا۔ منہ سے کف جاری تھا اور حالت غیر تھی۔ لگتا تھا کہ اس کی روح مجروح اور مفتوح ہو چکی ہے۔ مکروہ شخصیت ابھی تشنہء تکمیل ہے جو مکمل ہونے کے لیے جانے کب سے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ آج تو قیامت گزر رہی تھی اس پر۔ بوریے پر پھسکڑا مارے بیٹھا کوما سر پیٹ پیٹ کر دیبا کا "سیاپا" کرنے میں مصروف تھا۔

"کوئی چور کو ڈھونڈو یارو۔ میرے گھر میں ڈاکا پڑ گیا۔ کوئی دیبا کو تلاشو۔ میری جنت آج اجڑ گئی۔ اے اللہ! میں نے کیا قصور کیا تیرا جو تو نے سب کچھ دے کے چھین لیا۔" اس نے آسمان کی طرف اشارہ کر کے سینے پر دوہتڑ مارا اور چیخا:

"اصل میں سب سے بڑا ظالم تو ہی ہے۔ بس تو ہی ہے۔ میں نے سمجھ لیا۔"

کوے کی دیبا جو ہر وقت آس پاس منڈلاتی نظر آیا کرتی تھی۔ آج نہیں تھی۔ وہ جا چکی تھی۔ مولسری کے گھنے درخت کے نیچے بچھے ہوئے بوریے کا بستر چھوڑ کر مولسری کے پھولوں کی چادر خوشبو میں بسی موجود تھی پر وہ جا چکی تھی۔ پٹرول' ڈیزل اور نامعلوم کون

کون سے ڈبوں، کنستروں سے بنی رام ریکھا پھاند کر سیتا جا چکی تھی۔ انسانوں کے جنگل میں اس کا کھرا کھوجنا مشکل تھا۔ ریلوے سٹیشن کے نوع بنوع ہجوم میں چودہ برس کی نیم پاگل لڑکی کو ڈھونڈنا اگرچہ مشکل نہیں تھا تاہم کوے کی جنت کو جب حور نے تج دیا تو اسے تلاش کرنا کسی کے بس میں نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ کوا اپنی الگ دنیا کا آدمی تھا۔ وہ غم سے نڈھال، غصے سے بے حال، اپنے جن جذبوں کا اظہار کر رہا تھا اس سے اس کی ذہنی حالت کا باآسانی اندازہ ہو سکتا تھا۔ یہ تجربہ شاید اس کے لیے نیا تھا تبھی وہ نئی نئی گالیاں، کوسنے ٹکسال کرنے پر مجبور تھا۔

ان دنوں لاہور ریلوے سٹیشن پر میرا ہر روز کا آنا جانا تھا۔ میں لائبریری سائنس میں ایم اے کرنے کے لیے دوبارہ طالب علم بن گئی تھی لہذا پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس کے لیے بس پکڑنا میرا معمول تھا۔ گرمیوں کی صبح چھے بجے اچھا خاصا دن ہو تا ہے۔ یونیورسٹی جانے والے طلبہ کی کافی تعداد صبح ساڑھے پانچ بجے ریلوے سٹیشن کے باہر جمع ہو جاتی۔ میرا آخری سال تھا۔ عمر اور تجربے میں میں باقی طلبہ سے بڑی تھی۔ اس لیے میری کوشش یہ ہوتی کہ میں سب سے پہلے پہنچوں تاکہ بس میں جگہ لینے کے لیے میرا حق فائق سمجھا جائے۔ ان دنوں پنجاب یونیورسٹی کی نیلی باڈی بس میرا محبوب تھی اور شاید ہم سب طالب علموں کی وقتی تمناؤں کا مرکز۔ یہ نیلی بس مولسری کے درخت کے نیچے، فٹ پاتھ کے ساتھ آ کر جب کھڑی ہو جاتی تو سب اس کی طرف یوں لپکتے جیسے ارد گرد کچھ موجود ہی نہ ہو۔ اس افراتفری میں کئی بار کوے کا گھر بھی زد میں آیا جو فٹ پاتھ کے دوسری طرف ڈبوں، کنستروں اور کنٹینروں کو جوڑ جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ مولسری کے تنے کے ساتھ ٹین کا ٹرنک اس کے اوپر رضائی بستر، پھلوں کی خالی پیٹیوں پر سجے ہوئے گلاس، پیالیاں، مگ، تھالیاں، دیگچیاں اور نہ جانے کیا کیا۔ یہ کوے کا مکان تھا۔ جس میں وہ برسوں سے رہ رہا تھا۔ جس کو دیبا کی موجودگی نے گھر بنا دیا تھا۔

دیبا عام ناک نقشے کی پاگل لڑکی کوے کی تمام تر توجہ کا محور ـــــ اس محدود ایریا میں

ادھر ادھر قلانچیں بھرتی کوے کی نظر سے ذرا دیر کو اوجھل ہوتی تو قیامت آ جاتی۔ وہ سارے کام چھوڑ چھاڑ کے اس کے پیچھے آوازیں دیتا دوڑتا۔ بہت موہ تھا اسے دیبا کا۔

طالب علم جو یہاں کھڑے ہوتے تھے اپنے اپنے انداز سے بس کا انتظار کرتے۔ بعض نوجوان طلبہ گردوپیش سے بے خبر آنکھی آنکھوں اور چمکتے چہروں کے ساتھ ایک دوسرے میں کھوئے رہتے۔ کچھ ہنسی ٹھٹھے میں وقت گزارتے۔ میری دلچسپی کی چیز کوما اور اس کی گرہستی تھی۔ ڈبوں کے احاطے کا یہ مکان نہ معلوم اس نے کتنے برسوں میں بنایا ہوگا۔ اس گھر کی چھت' مولسری کا گھنا درخت' برسات کے موسم میں اس پر خوشبودار پھول نچھاور کرتا رہتا۔ کس قدر آئیڈیل چھت تھی۔ تاہم میں سوچتی تھی کہ بارش' آندھی اور سخت سردی میں اس گھر کے مکین کہاں جاتے ہوں گے۔

یہیں کھڑے کھڑے مجھے اندازہ ہوا کہ ایک طویل عرصے سے وہ اس جگہ پر قبضہ جمائے ہوئے ہے۔ اسی درخت کے نیچے وہ لڑکپن سے بالغ ہوا اور یہیں رہتے رہتے اب بڑھاپے سے بغلگیر ہو چکا ہے۔ مڑی تڑی ٹانگیں' دبلا پتلا جسم مگر حرکت میں بلا کی تیزی جو یقیناً اس کے پیشے کی دین تھی۔ چپٹے چہرے پر ڈاڑھی شاید کبھی اگی نہ تھی۔ چپٹی سی ناک اور گڑھوں میں تڑپتی مچھلیوں جیسی دو آنکھیں جن میں سے ایک سلامت تھی اور دوسری میں پھولا تھا۔ ان آنکھوں سے ہر وقت پانی رستا جنھیں کوما اپنے گندے میلے ہاتھوں کی پشت سے مسلسل صاف کرنے میں مصروف رہتا۔ مزاجاً وہ بے فکرا اور اپنی دھن کا آدمی تھا۔ خوش باش گن گن گاتا ریلوے اسٹیشن کے باہر آنے جانے والی گاڑیوں' ٹیکسیوں کے پیچھے بھاگتا' پکارتا للکارتا۔ گاڑیوں پر کپڑا مارنا اس کا پیشہ تھا۔ ٹیکسیوں' ویگنوں کے ڈرائیور' کنڈکٹر' کوے کے یار تھے۔ وہ ان کی مٹھی چاپی کر کے بھی چار پیسے بنا لیتا تھا۔ پر آج کوے کا پھرتیلا پن بورے پر ڈھیر ہو چکا تھا۔ وہ آج بے حد بدحواس اور بوڑھا دکھائی دیتا تھا۔

اس کے یار ڈرائیور' کلینرز' ہاکیے اس کے گرد نیم دائرے کی شکل میں ایسے کھڑے تھے جیسے کوئی موت واقع ہو گئی ہو۔

"اوئے! کملا ہو گیا ایں یار۔۔۔۔۔ اوئے رباں لئی اینا نئیں تڑفی دا۔۔۔۔۔"

یہ اس کے دوست بانکیے کی آواز تھی۔

"وہ' یہیں کہیں ہو گی۔ کہاں جائے گی۔ مر تو نہیں گئی۔"

کسی اور نے تسلی دی۔

"نہ۔۔۔۔ نہ۔۔۔۔ یہ نہ کہو۔۔۔۔"

کوے کا واویلا بڑھ گیا۔

"میں نے اسے اتنی سی کو پالا تھا۔۔۔۔" اس نے ہاتھ کی بالشت بنا کر دکھائی۔ اس کی حال دہائی سے لوگ محظوظ تو ہو رہے تھے لیکن انھیں اس کی حالت زار سے ہمدردی بھی تھی۔ ایک نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے مشورہ دیا۔

"چل کوے' تھانے میں رپٹ لکھا دیں۔ ہم تیرے ساتھ چلتے ہیں۔"

"نہ۔۔۔۔ نہ۔۔۔۔ توبہ میری پولیس سے۔۔۔۔ ان کے ہتھے چڑھ گئی تو جان سے جائے گی۔۔۔۔۔ پر میں کیا کروں؟ بتاؤ کیا کروں میں؟ اس نے آج ناشتہ بھی نہیں کیا۔۔۔۔ بھوکی چلی گئی۔ دیبا' دیبا۔" کوا دھاڑا۔

دیبا کی دماغی حالت اگرچہ مخدوش تھی مگر جسمانی حالت اچھی تھی۔ اس کی غیر موجودگی کا احساس مجھے بھی ہو رہا تھا۔ اس کے بغیر کوے کا نہ صرف دل بلکہ گھر بھی خالی خالی تھا۔ تبھی اسے کسی پل چین نہ آتا تھا۔ کسی کا کوئی مشورہ اچھا نہ لگتا تھا۔ کوے نے جس نازو نعم سے دیبا کو پالا پوسا۔ اس کا اندازہ کسی اکلوتے بچے کی ماں کو ہی ہو سکتا ہے دوسرے کو نہیں۔ وہ ہر صبح ناشتے کا دونا پکڑے اس کے پیچھے پیچھے دوڑتا۔ کبھی حلوہ پوری' کبھی نان نہاری' کبھی بند ملائی' کبھی دہی کلچے' وہ منہ سے ناشتے کے انواع دہراتا' ہنستا' کھلکھلاتا' ادھر ادھر لپکتا' وہ چوکڑیاں بھرتی بمشکل ہاتھ آتی تو بوری پر بٹھا کر اپنے ہاتھوں سے نوالہ نوالہ کھلاتا اور خوش ہوتا۔

"کھایا پیا کر۔ تو کھاتی کیوں نہیں؟ تو سمجھتی کیوں نہیں میں کتنا دکھی ہوتا ہوں۔۔۔۔ تیرے نہ کھانے سے۔"

لیکن دیبا کو کیا خبر کہ اس کا دکھ کیا اور کیسا ہے؟ وہ ہنستا کر اپنے فراک کی جھولی الٹ دیتی۔ گلے سڑے پھل' رنگ برنگے پنے' پلاسٹک کے ٹوٹے پھوٹے کھلونے اور نہ معلوم کیا کیا الا بلا سامنے بکھر جاتا۔ کوما ماتھا پیٹ کے کہتا:

"تجھے کب عقل آئے گی دیبا؟"

اور دیبا خوشی سے اچھل کر کوے کے گلے میں بانہیں ڈال کر چٹ چٹ چومنے لگتی۔ اس پر کوے کو جوش آ جاتا۔

"ایسی حرکتیں مت کیا کر سب کے سامنے۔ اب تو بڑی ہو رہی ہے۔"

وہ دیبا کو محبت میں سنی ہوئی جھڑکی دیتا اور وہ "کھی کھی" ہنستی۔ ناشتے پر مل پڑتی۔ دونوں ایک ہی پیالے میں لقمے ڈبو ڈبو کر کھاتے۔ کوما چائے کا ایک گھونٹ خود پیتا۔ دوسرا گھونٹ پھونک مار کر' ٹھنڈا کر کے دیبا کو پلاتا۔

ایسے موقعوں پر اگر کوما کسی کو اپنی طرف متوجہ پاتا تو قدرے جھینپ کر صفائی پیش کرنا ضروری سمجھتا' یادوں کو کریدتا' منظر بہ منظر بیان کرتا:

"یہ پوس کی ایک ٹھنڈی رات تھی۔ ہوا نام کو نہ تھی۔ روشنیوں کو دھند نے لپیٹ لیا تھا۔ مجھے کچھ فاصلے سے کتے اور بلی کے بھونکنے اور غرانے کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر ایک چیخ ابھری۔ میں نے لحاف پرے پھینکا اور کتے بلی کو شتکار دیا۔ نحیف چیخ اب بھی سنائی دیتی تھی۔ میں اٹھا۔۔۔۔ اسی فٹ پاتھ کی بات ہے۔۔۔۔ میں نے دیکھا کپڑے کی ایک پوٹلی سی ہے اور پوٹلی میں حرکت ہے۔ میں نے اس پوٹلی کو اٹھا لیا۔ پول کی روشنی میں دیکھا تو یہ تھی۔ گوشت کا لوتھڑا۔۔۔۔ انسان کا بچہ۔۔۔۔ دیبا۔۔۔۔ میں اس کو اپنے بستر میں لے آیا۔ سینے کی گرمائی دی۔ دیکھو جی اللہ جسے چاہے رکھے۔ اس نے اسے میرے لیے بھیج دیا۔ بندہ بندے کی ضرورت ہے۔ زندگی تھی اس ننھی جان نے کتے بلی کے خلاف احتجاج کیا اور بچ گئی۔ ورنہ اس رات ہی ہڑپ ہو جاتی۔ پھر میں نے اس کا نام فرح دیبا رکھا۔ ان دنوں اس نام کا بڑا رواج تھا۔ کہتے تھے کسی ملکہ کا نام ہے۔ اب میری دیبو

کسی ملکہ مہارانی سے کم تھوڑی ہے۔ بلکہ یہ تو میری جنت کی حور ہے۔"

کوما بڑھ کر دیبا کی بلائیں لیتا بالکل ایک ماں کی طرح جیسے وہ اس کا شاہکار ہو۔

دیبا اب جوانی کی دہلیز پر کھڑی تھی۔ بے نیاز' بے وقوف' بے سمجھ اور بے خوف۔ وہ کوما کی بالکل پروا نہ کرتی۔ بعض اوقات ضد پر اتر آتی تو کوے کی شامت آ جاتی۔ گھونسے' لاتیں مار مار کر اتنا پریشان کرتی کہ کوما میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوتا۔

"تو۔۔۔۔تو۔۔۔۔" وہ ہانپتا "تو سچ مچ کسی کتیا کی بچی ہے۔"

دیبا اپنی لکنت زدہ زبان میں کچھ بڑبڑاتی۔ جسے شاید کوما ہی سمجھ سکتا ہو۔

کوما اور دیبا کے بارے میں میری یہ ساری معلومات کئی مہینوں میں مکمل ہوئی تھیں۔ اور میں اس نتیجے پر پہنچی کہ کوے کی دنیا دیبا ہی ہے۔ گرمی کی لمبی دوپہروں میں کوما' دیبا کے لمبے لمبے بالوں میں سے جوئیں نکالتا۔ کبھی کس کے چٹیا باندھ دیتا کبھی دو چوٹیاں گوندھ کر ربن کے پھول سے بنا دیتا اور رنگ برنگے کلیوں پتوں سے سجا دیتا۔ اس کے کپڑے دھوتا اور سلیقے سے تہہ کر کے صندوق میں سینت کر رکھ دیتا۔ دیبا اس کے لیے اچھا خاصا مشغلہ اور مصروفیت تھی۔

انہی دنوں موسم گرما کی تعطیلات ہو گئیں۔ میرا یونیورسٹی آنا جانا بند ہو گیا۔ لہٰذا تین ماہ کے عرصہ میں کوما اور دیبا ذہن سے محو ہو گئے۔

یہ ستمبر کی ایک صبح تھی۔ یونیورسٹی کھل چکی تھی۔ میں بس پکڑنے ریلوے سٹیشن پہنچی ایسے لگا جیسے تین مہینے نہیں ایک دن گزرا تھا۔ اردگرد کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ کوما حسب معمول اپنے نجی کاموں میں مصروف تھا۔ البتہ دیبا بالکل بدل چکی تھی۔ پہلی نظر میں تو وہ پہچانی ہی نہیں گئی۔ ان تین مہینوں نے اسے خاصا لمبا اور جوان کر دیا تھا۔ آج وہ گوٹے کناری والی لال رنگ کی میکسی پہنے ہوئے تھی۔ دونوں ہاتھوں میں مہندی رچی ہوئی۔ بانہوں میں لال ہری چوڑیاں۔ کانوں میں سنہری جھمکے' گلے میں موتیوں کی مالا اور ہونٹوں پر سرخی۔ کوما اس کے گیلے بالوں میں کنگھی کر رہا تھا۔ وہ پھسکڑا مار کر بیٹھی کسی بات پر ہٹ کر رہی تھی۔ میں نے کوما کو کہتے سنا:

"شادی کو ڈیڑھ دن نہیں گزرا۔ کپڑوں کا حال دیکھو۔ چچ چچ۔۔۔۔ دیبا! تجھے عقل نہ آئی۔"

تب میری نگاہ دیبا کے کپڑوں کی طرف ناقدانہ گئی۔ کافی مسلے ہوئے تھے۔ گوٹا جگہ جگہ سے ادھڑ چکا تھا اور چھلتے پڑے ہوئے تھے وہ تقریباً کومے کی گود میں کھسکتی ہوئی نیم دراز ہونے کو تھی کہ کومے نے اسے سیدھا کرتے ہوئے کہا:

"بیٹھ تو سہی۔۔۔۔"

دیبا کے بدن میں جیسے بجلی کا بٹن دب گیا اور کرنٹ دوڑ گیا۔ دیبا وحشیانہ انداز سے پلٹی اور کوما کی گردن میں دونوں بازو ڈال کر اسے چاروں شانے چت کر دیا۔ پھر اس کے سینے پر سوار ہو کر اس کے گال اپنے پنجوں میں جکڑ لیے۔

"ہُنا۔۔۔۔ کوما۔"

وہ غرائی۔ کوما ہنستے ہوئے اپنے آپ کو اس کے پنجوں سے چھڑانے کی ناکام جدوجہد میں تھا۔ اس کی دبی دبی سرزنش میں مروت تھی۔ پیار تھا۔

"ارے ہٹ۔۔۔۔ ہٹ دیبا۔ رانی تو غصے میں کیوں آگئی۔ میں کوئی تیرا دشمن ہوں۔۔۔۔؟ تیرا گھر والا ہوں۔۔۔۔ ہٹ' لوگ کیا کہیں گے۔ ارے تو سمجھتی کیوں نہیں؟"

پر دیبا کا غصہ زوروں پر تھا۔

جب بپھری ہوئی دیبا نے اپنے دانت کومے کی جھریائی گردن میں گاڑ دیئے تو معاملہ کافی گھمبیر ہو گیا۔ لوگ اسے چھڑانے کے لیے آگے بڑھے۔ کوما کی گھگی بندھ گئی تھی۔

"چھڑاؤ' چھڑاؤ۔۔۔۔ اف یہ پاگل ہو گئی ہے۔"

"ہُنا۔۔۔۔ ہُنا۔۔۔۔"

وہ غالباً کوما کو کُتا کہہ رہی تھی۔

دیبا کو بولتے' بات کرتے کبھی کبھار ہی سنا تھا۔ اس کا رمز شناس کوما ہی تھا۔ بس وہ چپ چاپ کٹھ پتلی کی طرح ایک محدود ایریا میں گھومتی پھرتی رہتی تھی۔ آج وہ جنگلی بلی کی طرح

خر خر کرتی کوما کو پنجوں میں "مدھول" رہی تھی۔ کوما اس کے سامنے چوہا لگتا تھا۔ مکروہ اور بدبخت۔

کچھ کلینز' ڈرائیور ہنستے مذاق کرتے لپکے اور کوما کو دیبا سے چھڑا لیا۔ دیبا دانت کچکچاتی ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی اور نفرت سے کوے پر تھوکا۔ یہ تھوک کوے کی گردن سے چوسا ہوا لہو تھا جو وہ کوے کو لوٹا رہی تھی۔ اس نے میکسی کا دامن اٹھا کر ہونٹوں کو صاف کیا تو کولہوں تک ننگی ہو گئی۔ اس کی ٹانگیں گوری' سڈول اور سیدھی تھیں۔ شاپ پر کھڑے لوگوں نے میکانکی انداز سے رخ دوسری طرف پھیر لیے۔

کوما کپڑے جھاڑتا' کھسیانی ہنسی ہنستا اس کے پاس آ کے بیٹھ گیا۔

"شیرنی ہے کمبخت۔۔۔۔"

اس کے ہم عمر اور جاننے والے ہانکیے نے لوری لہجے میں ہانک لگائی:

"کوئی گل نہیں یار۔ تگڑا رہ۔ شیر بن شیر۔"

اور تبھی میرے قریب کھڑے ایک طالب علم نے دوسرے سے پوچھا۔

"یار کتے کے کاٹے کا تو علاج ہے۔ انسان کے کاٹے کا بھی کوئی علاج ہے؟"

"نہیں' بندے کے کاٹے کا علاج نہیں۔"

دوسرے نے گویا جان چھڑائی۔ اتنے میں بس آ گئی۔ ہم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بس میں لد گئے۔ بعض لڑکیاں لڑکے آج کے دنگل پر کچھ دیر کمنٹری کرتے رہے پھر بھول بھال گئے۔

گنجان شہروں کے گلی کوچوں' سڑکوں چوراہوں پر ہر وقت اس قسم کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ انسان جب وحشی ہو جاتا ہے تو جگہ بے جگہ نہیں دیکھتا حریف پر پل پڑتا ہے۔

دیبا والا منظر بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ تاہم یہ بات طے تھی کہ کوے نے کل یا پرسوں ہی دیبا سے شادی کی تھی۔

شادی ایک نارمل بات تھی۔ کوے کے رویے سے ظاہر ہوا کرتا تھا کہ وہ دیبا کو بیٹی کے

طور پر پرورش نہیں کر رہا۔ بلکہ اس دن کے انتظار میں ہے جب پھل پک کر تیار ہو جائے۔

کسی مکروہ صورت بڈھے کا تیرہ چودہ برس کی لڑکی سے بیاہ رچالینا بھی کوئی اچنبھا نہیں۔ عام طور پر لڑکیاں چپ چاپ قبول کر لیتی ہیں۔ دیبا تو تھی بھی پاگل۔۔۔۔ دھینگا مشتی اس کا آئے دن کا معمول تھا۔ کوا اس کی ان حرکتوں سے خوش ہوتا تھا۔ بس دیبا کے کوا کو کاٹ کھانے والا واقعہ میرے لیے ذرا ابنارمل اور غیر معمولی تھا۔ ہر وہ واقعہ جس میں تھوڑا بہت خون خرابہ ہو معمولات سے ہٹ جاتا ہے۔ سو مجھے کرید تھی کہ ایسا کیوں ہوا؟

شکر ہے میری کرید اس وقت شانت ہوگئی جب اگلی صبح میں نے کوے کو دھڑ دھڑ سینہ کوٹتے اور دھاڑ دھاڑ روتے دیکھا۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ کوئی بڑا واقعہ ہو چکا ہے۔ وہ چلا چلا کر کہتا تھا:

"دیبا۔۔۔۔ دیبا! تجھے کوئی نہ پوچھے۔ تو نے میری جنت اجاڑ دی۔۔۔۔ نہیں نہیں تو نے نہیں کسی کتے نے میرا گھر اجاڑا۔ وہ تو بھولی تھی۔ وہ تو سیدھی تھی۔ لوگو! میں نے نکاح ہونے تک اسے چھوا نہیں تھا۔۔۔۔ ہائے۔۔۔۔ ہائے۔"

مگر وہاں کھڑے لوگ 'طلبہ' طالبات میں کوئی ایسا نہ تھا جو کوے کے دکھ کو بانٹ سکتا۔

(1988ء)

ooooo

اِک معرکۂ حق

انسان کی تمام زندگی کسی نہ کسی آدرش کے گرد گھومتی ہے۔ اس کے آدرشوں کا مرکزی نقطہ عام طور پر اس بقا کی شدید خواہش ہے جس پر وہ یقین کے ساتھ بھروسا کر سکے۔ عمر کے عملی اور جذباتی اتار چڑھاؤ اس مرکزی نقطے کو پکڑنے کی کوشش کے دوران پیش آتے ہیں۔ اگر بقاء کو کوئی کھٹکا نہ ہو تو انسان جدوجہد کیا سوچنا تک ترک کر دے۔

میں اس سڑک پر سے تقریباً ہر روز گزرتی ہوں۔ بسوں' گاڑیوں' ٹرک' ٹرالیوں' سکوٹروں' سائیکلوں' رکشاؤں' تانگوں' ریڑھیوں اور پیدل چلنے والوں کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر پار اترنا آسان کام نہیں۔ سب کرتے ہیں۔ وہی روزی روٹی اور بقاء کا مسئلہ مرحلہ در مرحلہ طے کرتے ہیں۔

راہ چلنے میں کسی کو ایک دوسرے کا ہوش نہیں ہوتا۔ البتہ کوئی چلتے میں راستہ کاٹے یا بیچ چوک رکاوٹ ڈالے تو ہر آدمی حسب توفیق گالیاں اور مغلظات کھلے منہ لٹاتا ہے۔ کیونکہ قیامت کی اس گھڑی میں جی ہلکا کرنے کا اس سے آسان اور موثر کوئی طریقہ نہیں سوجھتا۔

جی ہاں ـــــ میں لاہور کی جس مصروف سڑک کا تذکرہ کر رہی ہوں اللہ کے کرم سے اسے پاکستان کی شاہراہ کا درجہ حاصل ہے۔ شاہراہ بھی ایسی کہ جو پاکستان کے شمالی حصے کو جنوب مغربی حصے سے یوں ملاتی ہے جیسے شوریدہ دریا پر رسے کا پل۔

جگہ جگہ سے خطرناک' تنگ اور تجاوزات سے اٹی ہوئی اس سڑک پر کسی زمانے میں مزدوروں' ٹھیلا بانوں' چھابڑی والوں نے گھروندے بنائے تھے۔ جو آج بھی عالیشان عمارتوں اور پلازوں کے زیر سایہ اپنے وجود کی گواہی دیتے ہیں۔ اور پاکستان کی مفلوک الحال غالب آبادی کا جیتا جاگتا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

مجھے بات لمبی نہیں کرنی چاہیئے۔ جو کہنا چاہتی ہوں کہہ دینا چاہیئے۔ بلا جھجک' برملا۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں نا کہ منہ سے نکلی پرائی ہوئی۔ پرائی ہوئی تو پکڑی بھی گئی۔ پکڑی گئی تو خیر----

قصہ کچھ یوں ہے کہ اس سڑک کی بغل میں ایک پتلی سی گلی نکلتی ہے اور اس گلی کی نکڑ میں ایک چار منزلہ نئی عمارت کے بالکل پاؤں کے پاس 15 x 20 فٹ جگہ شاید کسی کی نہیں ہے۔ No man,s land کے طور پر نامعلوم کب سے پڑی تھی۔ نہ جانے کب سے لوگ اس میں کچرا پھینک رہے تھے۔ جو جگہ کسی کی نہیں ہوتی وہ سرکار کی ہوتی ہے۔ شہروں کی سرکار ٹاؤن کمیٹیاں یا کارپوریشن۔ لہٰذا عملہ صفائی نے اسے اپنی دسترس میں رکھ لیا۔ جمعدارنیاں یہاں پر کوڑا ڈھیر کرتی رہتیں' کبھی کبھی کارپوریشن کی ٹرالی یا چھکڑا کوڑے کا کچھ حصہ اٹھا کر لے جاتا۔

سہولت اور تن آسانی کا لپکا تو عمری میں بہت مزا دیتا ہے۔ سب سے زیادہ کوڑا کرکٹ مارتھی پھینکا کرتی تھی۔ بابا یعقوب کی سویٹ ہارٹ' مارتھی۔ سمارٹ' طرح دار اور شرارہ قسم کی الھڑ لڑکی' مارتھی۔ بابا یعقوب کارپوریشن میں ٹرالی ڈرائیور کے عہدے پر فائز تھا۔ اور اپنی برادری کا پنچ بھی۔ بڑے پنچ سے دوسرے نمبر پر۔ بابا یعقوب کا مقام ملازمت یا بڑے ادارے کے تعلق کی وجہ سے نہ تھا بلکہ پنچی ان کے خاندان میں کئی پشتوں سے وراثت کے طور پر چلی آ رہی تھی۔ اس کے گھر کی عورتیں مدت ہوئی گندا کام چھوڑ چکی تھیں۔ حتیٰ کہ اس کی چہیتی مارتھی بھی ایسے شوقیہ ایک دو بڑے گھروں کا کام سنبھالے ہوئے تھی۔ اور یہ اس لیے کہ یہ گھر بابا یعقوب کے افسروں کے تھے۔ ان افسروں نے مارتھی کے دو بھائیوں کو باہر بھجوایا تھا جو ہر ماہ گھر والوں کو بنک ڈرافٹ اور طرح طرح کے تحائف بھیجا کرتے تھے۔ مارتھی کو بابا یعقوب بلاوجہ اچھا نہیں لگتا تھا وہ

ایک شخصیت تھا منفرد اور نظر آنے والی۔ دیکھنے والے دور سے پہچان لیتے تھے کہ بابا یعقوب آ رہا ہے۔

سردی ہو یا گرمی۔ مطلع ابر آلود ہو یا دھوپ چمک رہی ہو۔ بابا یعقوب کی آنکھوں پر سیاہ چشمہ برابر لگا رہتا۔ لباس میں زیادہ ردو بدل نہیں کرتا تھا۔ بوٹ جرابیں ہمیشہ پہنتا۔ اگر چینٹ کالی ہے تو ٹیل اوور ضرور کالے رنگ کا ہوگا۔ اوپر سفید مفلر۔ گرمیوں میں سفید چینٹ گہرے تیز رنگوں والی شرٹ۔ سفید کیمشن۔ یہ رنگا رنگ لباس بابا یعقوب کی چمکدار سیاہ رنگت پر عجب بہار دیتا تھا اور اس کی شخصیت کو قابل توجہ بناتا تھا۔

بات ہو رہی تھی مارتھی کے کوڑا پھینکنے کی۔ مارتھی کی دیکھا دیکھی باقی عورتیں بھی وہیں ڈھیر کر دیتیں۔ ہمیشہ کچرے کا مینارہ سا بنا رہتا۔ کارپوریشن کی ٹرالی آتی کچھ اٹھاتی کچھ بکھیرتی یہ جا وہ جا۔ آس پاس رہنے والوں کی بار بار یاد دہانیوں اور درخواستوں سے اس فلتھ ڈپو کو ختم کرنے کے احکامات جاری ہوتے رہتے۔ لیکن ان کو عملی شکل اختیار کرتے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ بابا یعقوب بارسوخ آدمی ہے وہی رکوا دیتا ہے۔ بعض کا خیال تھا کہ ان افسروں کی آڑ ہے جن کے ہاں مارتھی کام کرتی ہے۔ بہرکیف 15 x 20 فٹ جگہ ایک متعفن مسئلہ تھی جس کی سڑاند سے سب بیزار تھے۔

ہمارے یہاں کے دکاندار لوگوں کو غور و فکر کرنے کے مواقع کم ملتے ہیں۔ ملتے ہیں تو کھا پی کر ڈکار لیتے ہیں۔ ویسے تجارت پیغمبری پیشہ ہے۔ اس سے منسلک لوگ عام طور پر معصوم و مغفور ہوتے ہیں۔ غور و فکر کی کیا ضرورت۔ پر دتے دودھ دہی والے کو روایت سے بغاوت نے آ لیا۔ کیا کیا کہ پہلے تو آبائی پیشہ دودھ دہی فروشی چھوڑ کر کڑاہی تکے، برگر بوتلیں بیچنی شروع کر دیں۔ پھر نوجوانوں کو مزید کھینچنے کے لیے وڈیو کیسٹ بھی رکھ لیے۔ رنگین ٹی وی اور وی سی آر کرائے پر دینے لگا۔۔۔۔ دکان خوب سجائی چمکائی۔ انڈیا اور امریکہ کے ایکٹروں گلوکاروں کے قد آدم پوسٹرز آویزاں کیے۔ نئے کاروبار کے رسمی افتتاح کے لیے کارپوریشن کے چیئرمین کو بلوایا۔ سپاس نامے میں سرفہرست گزارش یہ رکھی کہ اس کی دکان کے ساتھ جو سالہا سال پرانا فلتھ ڈپو ہے اس کو فی الفور ہٹایا جائے۔ اس کی وجہ سے اس کے گاہکوں یعنی پبلک کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ علاقہ اب کافی ترقی کر چکا ہے۔ اگر چیئرمین صاحب علاقے کے لوگوں کا یہ دیرینہ معاملہ مان کر اس

گندگی کا کہیں اور بندوبست کر دیں تو ہم ہمیشہ آپ کو الیکشن میں یاد رکھیں گے۔

بات کہنے کا سلیقہ تھا۔ الیکشن سر پر کھڑے تھے۔ وفا اور بقاء کے وعدے تھے۔ گویا قبولیت کی گھڑی تھی۔ اس تقریب کے اگلے روز صفائی ستھرائی کے احکامات جاری ہو گئے۔ اور ہفتے کے اندر اندر یہ 20 x 15 فٹ جگہ پوری کی پوری صاف ہو گئی۔ اگرچہ اس کے قریب سے گزرنے والے کے ساتھ بدبو کا بھبکا اب بھی مسخری کرتا تھا اور نفیس مزاج آدمی بلا توقف تھوکنے پر مجبور ہو جاتا تھا مگر آنکھوں کی خیر ہو گئی تھی۔

اب علاقے کے دیدہ ور آدمی اس 20 x 15 فٹ جگہ پر آنکھ رکھ رہے تھے۔۔۔۔ کہ ایک صبح صیداں کشور اور بشتی نے مل کر یہاں اپنے ٹوکرے الٹ دیئے۔۔۔۔ اب دتے کو پھر تشویش لاحق ہو گئی۔ اس کی دکان کی شو ختم ہونے والی تھی۔ بہت سوچ بچار کے بعد دتے نے بابا یعقوب کو اچانک ایک دوپہر اپنی دکان میں مدعو کیا۔ برگر اور گرم گرم چائے سے تواضع کی۔ اور نہایت درد بھرے رازدارانہ لہجہ میں کہنا شروع کیا۔

"چاچا۔۔۔۔ دیکھ۔۔۔۔ تمہاری برادری نے پھر گند ڈھیر کرنا شروع کر دیا ہے۔ کل کلاں کے ڈاڈھے بندے نے اس جگہ پر قبضہ کر ہی لینا ہے۔ تو بتا تجھے اس کا کیا فائدہ ہو گا۔۔۔۔ یہ بیبیاں باز نہیں آتیں۔ میں کہتا ہوں تو اس پر قبضہ کیوں نہیں کر لیتا۔ سوئے پوچھتے ہیں۔ میں تمہاری بہت عزت کرتا ہوں۔ تو اپنی برادری کے لوگوں کو سمجھا سکتا ہے۔"

بابا یعقوب گرم چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے کچھ دیر تک ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ سوچتا رہا، پھر دھیرے سے بولا۔

"چودھری جی! آپ ہی کوئی رستا نکالو۔۔۔۔ برادری کو میں سنبھال لوں گا۔۔۔۔"

دتے نے اپنا منہ بابا یعقوب کے کان کے قریب کر کے کوئی نہایت معقول تجویز پیش کی جس سے بابا یعقوب کی باچھیں کانوں تک کھل گئیں اور وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

جس طرح انسان کا جسم کئی قسم کی ہڈیوں، ماس بوٹیوں، بافتوں سے مل کر بنتا ہے۔ اسی طرح اس کے جذبات کے بغچے میں بھی بہت کچھ بھرا ہے۔ محبت کی رنگ برنگ کرنیں۔ خلوص کی کئی قسمیں۔ وابستگیوں کے الجھے ریشمی دھاگے۔۔۔۔ روایتوں اور رسموں کی سنبھال سیمنٹ کے گاڑی ہوئی سوئیاں، بلندیوں میں کئی پستیاں اور پستیوں میں کئی بلندیاں۔

بابا یعقوب بمشکل جذبات پر قابو پا سکا۔ پھر دھیمے سبھاؤ مگر جوش کے ساتھ بولا۔۔۔
"چودھری جی! مان گئے' مان گئے آپ نے اندر خانے ساتھ دینا ہوگا۔"
"میں روشن خیال آدمی ہوں چاچا۔۔۔" پھر کچھ توقف کے بعد دتے نے پینترا بدلا۔
"جب سکیم ہی میری ہے تو میرے ہاتھوں پروان چڑھے گی ان شاء اللہ۔ تم قائم رہنا۔۔۔ میں نے اوپر بات کر لی ہے۔ لین دین ہو گیا ہے۔ بس تم کہنا مجھے خواب میں بشارت ملی ہے۔۔۔ بیان نہ بدلنا۔۔۔ تمھارا کام اتنا ہی ہے۔"
"واہ چودھری جی۔۔۔ وہ جو کہتے ہیں نہ کہ سر بڑے سرداروں کے وہ سچ ہی کہتے ہیں۔۔۔ اور اس پر اعتراض بھی کسی کو نہیں ہوگا۔ نہ شیداں کو نہ میداں کو۔۔۔ نہ سردار مسیح کو نہ لال مسیح کو۔ آپ پرسوں دیکھ لیں گے۔ کیسی صفائی ہوئی ہے۔۔۔ آپ کی بہت بہت مہربانی۔"
بابا یعقوب سر سے پاؤں تک خوشی میں بھیگا کندھوں کو جھٹکتا اکڑتا گھر کی طرف چلا آیا۔ اسے ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ جیتا جاگتا آسمان کی طرف اٹھ رہا ہے۔ اس کے وجود کی تطہیر ہو چکی ہے۔ نسل در نسل بدن میں بسی ہوئی بدبو رفتہ رفتہ خوشبو میں بدلنے کو ہے۔ ساغرِ زندگی شرابِ طہور سے لبریز چھلکنے کو ہے۔۔۔ وہ کوئی بہت ہی اچھا کام کرنے جا رہا ہے شاید زندگی میں پہلی بار جس سے رب اور اس کے بندے ایک ساتھ راضی ہوں گے۔
تیسرے روز لوگوں نے دیکھا کہ اس 15 x 20 فٹ جگہ کی نئے انداز سے صفائی ہو رہی ہے۔ میداں' مارتھی' کشور اور نہ جانے کون کون مرد عورت جوش و جذبے سے اس جگہ کو دھو رہے تھے۔ پانی کا پائپ چودھری اللہ دتا نے مہیا کیا تھا۔ چھوٹے بچے کہیں سے اینٹیں ڈھو ڈھو کر لا رہے تھے۔ محلے والے اس خیال سے خوش کہ جمعداروں کو از خود خیال آ گیا۔ بابا یعقوب کی تعریف بلند آواز میں ہو رہی تھی۔
ماسٹر غلام اسحاق جو گلی میں سے ایسے گزرتے جیسے نکی میں سے ہوا آج نکڑ پر کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر تک مسکراتے رہے اور بولے "شاباش بئی شاباش اللہ جب ہدایت دے دے۔۔۔ اس کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں۔۔۔"
بابا یعقوب کے بارے میں تاثرات دیتے ہوئے کہا۔
"یعقوب اثر و رسوخ والا آدمی ہے۔ ایسے تو نہیں۔"

اسی طرح جو بھی وہاں سے گزرتا معترفانہ نگاہ ڈالنے کے لیے رکتا۔ اظہار خیال کرتا چلا جاتا۔ کام کرنے والوں کے حوصلے بلند ہو رہے تھے۔

اب دن ڈھل گیا تھا۔ سائے لمبے اور گہرے ہو رہے تھے۔ سارا دن سکڑ کر شام ہو گیا تھا۔۔۔۔ بچوں اور بڑوں نے مل کر 15 x 20 فٹ جگہ کے دونوں طرف اینٹیں چن کر ایک طرف دروازہ سا بنا دیا تھا۔۔۔۔

تب میداں دوڑی دوڑی گھر سے اپنے جہیز کی میز اٹھا لائی اس پر اپنے ہاتھ سے بنا ہوا کروشیے کا سفید میز پوش ڈال دیا۔ کشور کاغذ کے پھولوں کا گلدستہ لے آئی۔ بچے کریانے کی دکان سے موم بتیاں پکڑ لائے۔

پھر یعقوب جو برادری کا پنچ تھا۔ دوسرے پنچوں کے ساتھ اس 15 x 20 جگہ پر نمودار ہوا۔ سرپنچ نے آگے بڑھ کر اپنی چادر کی بُکل سے مصلوب عیسیٰ علیہ السلام کا مجسمہ نکالا اور عقیدت و احترام کے ساتھ میز پر رکھ کر اس کے آگے شمع روشن کر دی۔ پھر ہاتھ جوڑ کر آنکھیں موند لیں۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"اے مقدس باپ! آج سے یہ جگہ تیرے نام کی برکت سے پاک ہے۔"

سرپنچ اور باقی پنچ بابا یعقوب اور دوسرے چھوٹے بڑے سب ہی ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑے تھے۔ ان کے سر احترام کی وجہ سے جھکے ہوئے' آنکھیں پاک تصور سے مندی ہوئی اور دل الوہی تجربے سے گداز تھے۔ عورتوں پر تو جیسے رقت طاری تھی۔ جسم و جاں تطہیر کے عجب مراحل سے گزر رہے تھے۔ اچانک ماحول میں نور پھیل گیا۔ سب کی آنکھیں پٹاک سے کھل گئیں۔ انھوں نے بیک نگاہ دیکھا کہ میز کے عین اوپر جہاں مصلوب مسیح کا مجسمہ دھرا تھا مرکری ٹیوبز سے بنی صلیب روشنی بکھیر رہی ہے۔

بچوں کی نظر میں یہ ایک کرشمہ تھا مقدس روح کا۔ عورتوں کے خیال میں خدا نے ان کی دعائیں قبول کر لی تھیں۔ اور مرد اپنی کامیابی پر نازاں و فرحاں تھے کہ وہ دین کی خدمت میں سرخرو ہوئے۔

15 x 20 فٹ جگہ گزشتہ کچھ برسوں سے جوں کی توں صاف ہے۔ صلیب نما مرکری ٹیوب ہر رات اپنا نور پھیلاتی ہے۔ اب وہاں کوئی کوڑا پھینکنے کی جرأت نہیں کرتا۔ وہاں

پہلی سی سیلن نہیں رہی۔ تعفن بھی نہیں۔ نہ معلوم کیوں ڈیڑھ دیوار دو فٹ اونچی نہیں ہو رہی سنا ہے چوری کے ڈر سے کشور اپنی میز اٹھا کر لے گئی ہے۔ بابا یعقوب نے مصلوب عیسیٰ کا بت دوبارہ اپنے گھر کے طاقچے میں رکھ لیا ہے۔

یہ بھی سنا ہے کہ علاقے کے لوگ کارپوریشن سے بات چیت کر رہے ہیں۔ دتہ چودھری اپنے طور پر کوشش میں ہے کہ یہاں ایک چھوٹا سا ریستوران بنا لے۔

معتبرین کا خیال اجتماعی منافع کی طرف ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس 15 x 20 فٹ جگہ پر ایک ننھی منی cute سی مسجد تعمیر کر دی جائے۔ اوپر مسجد' نیچے دو دکانیں اور سکاوا بن جائے۔

بابا یعقوب کے پاس خواب والی دلیل بہت مضبوط ہے اور اس کے پیچھے ایک مضبوط برادری بھی موجود ہے۔

تاہم مقدمہ دیوانی ہے۔ ابھی سیشن کورٹ میں چل رہا ہے۔ حق کی لڑائی کئی میدانوں میں لڑی جا سکتی ہے۔ ہائی کورٹ ہے۔ سپریم کورٹ ہے۔ پھر آخری اپیل بھی ہو سکتی ہے۔

زندگی کے میلے ہیں۔ حق کے معرکے ہیں۔ بقاء کی دلیلیں ہیں۔

یار زندہ صحبت باقی۔

(1988ء)

OOOOO

جب بجا کٹورا

میاں جی نے حج کرنے کی نیت تو اسی وقت کر لی تھی جب وہ جوان ہوئے تھے۔ ہوا یہ کہ جب ان کی ہیئت نے انہیں کسی غیراللہ سے لو لگانے کی ہمت نہ دی تو وہ اللہ والے ہو گئے۔ اللہ سب کا ہے۔ وہ ہیئت وہیئت نہیں دیکھتا۔ پھر اس سے لو لگانے میں عقل' شکل' مال یا سن و سال کی قید بھی نہیں' اللہ سے محبت کے لیے تو یہ کہنے کی بھی ضرورت نہیں کہ:

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار ۔۔۔۔۔ جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

وہ تو شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ ہر سانس میں ہے' خدا کے متعلق میاں جی سیدھا سادا تصور رکھتے تھے کہ جب سانس اپنے آپ آتی جاتی رہتی ہے تو خدا بھی اپنے آپ انسان کے بیچ بسا رہتا ہے۔ جب ایک کے بعد دوسری سانس نہیں آتی تو جان لو اس بت کو خدا نے چھوڑ دیا۔

میاں جی اگر پیدائشی کبڑے نہ ہوتے تو شاید اتنی سادگی اور سہولت کے ساتھ خدا کے تصور کو باور نہ کرتے۔ ہر لحاظ سے صحیح سالم انسان خود کو خدا کے مقابلے پر دیکھتا ہے۔ اور اس کا راستہ بھول بھلیاں میں گم ہونے لگتا ہے۔ خدا کی تلاش میں وہ کبھی بلھے شاہ پڑھتا ہے' کبھی شاہ حسین اور کبھی بھٹائی اور اگر زیادہ پڑھا لکھا ہو' تو نطشے کا سپرمین بننے کی کوشش کرتا ہے۔ پاکستانی تو اور سہولت میں ہیں کہ وہ علامہ اقبال کے مرد مومن کی

تشریحات اور مناجات کے سہارے خود آگہی کی منازل طے کرتے ہوئے خود کو سالک کے رتبے پر فائز کرنے کی کوشش میں ماہر فن' عالم و فاضل اور نہ جانے کون کون سے القابات سے شخصیت کو سجاتے بناتے ہیں' پر بغل کا چور پکڑا نہیں جاتا۔ میاں جی کو سجنے بننے کی حاجت نہیں تھی۔ وہ جانتے تھے کہ بنیں بھی تو کیا بنیں' سو انھوں نے ظاہری حسن کو حرص و ہوا جانا' سراب سمجھا' قدرت نے انھیں بدن کی مہمات کے سفر کا چسکا لگایا ہی نہیں تھا' اک مڑا تڑا جسم دے کر انھیں ہستی کے فریب سے نکال دیا تھا۔ وہ بہت سی دنیاوی آلائشوں سے پاک اور پرے پرے رہے۔ اگر کسی کی طرف از خود کھنچے تو کوئی انھیں اپنی طرف کھینچنے کی تمنا کرتا۔

میاں جی کو وہ دن ہمیشہ یاد رہا۔۔۔۔ وہ گھڑی' وہ پل' جب انھیں احساس ہوا کہ وہ جوان ہو گئے ہیں۔ وہ دن کیا تھا؟ قیامت کا دن تھا؟ وہ حسب معمول عطر چپلیل میں نہائے گھر سے نکلے۔ لٹھے کا کھڑ کھڑ کرتا پاجامہ' کریزیں خوب جمی ہوئیں' سر پر جالی دار سفید ٹوپی کہ ہوا کا گزر سر کو برابر ٹھنڈا رکھتا رہے' پاؤں میں لال دھوڑی کا دیسی جوتا' جس پر سنہری تلے کی صرف ایک نکی بنی ہوئی تھی۔ چھڑی کے سہارے تیز تیز چلتے تھے۔ نچی ڈاڑھی کے نرم سیاہ چھدرے بال ہوا میں ایک ایک لہراتے تھے۔ انھیں اپنی ڈاڑھی پر فخر تھا کہ اس پر قینچی نے کبھی دست درازی نہ کی تھی۔ میاں جی ہر وقت اس پر ہاتھ پھیرتے رہتے تاکہ قابو میں رہے' اپنی نچی ڈاڑھی کی طرح وہ خود بھی نچے تھے۔

عطر میں بسے وہ نماز جمعہ ادا کرنے کی غرض سے شاہی مسجد کا رخ کرتے۔ شاہوں کی مسجد میں جا کر سجدہ کرنے کا لطف ہی اور تھا۔ یہ معمول انھوں نے بچپن سے باندھ رکھا تھا۔ کہ نماز عیدین اور دوسری خاص خاص نمازیں لاہور کی شاہی مسجد میں ہی ادا کی جائیں' اب تو ایک اصول اور عادت سی بن گئی تھی۔ راستہ پاؤں کو کچھ ایسا لگا تھا کہ قدم اپنے آپ اس طرف اٹھتے' میاں جی کشاں کشاں چلتے جاتے۔

یہ کھیرے ککڑی کا موسم تھا' ریڑھی چھابڑی والوں نے کومل ککڑیوں' کھیروں پر گلاب کے پھول سجا رکھے تھے۔ ہوا میں لذت و لطافت رچی تھی۔ جسم و جاں میں لہریں سی اٹھ کر

گدگدی کی کیفیت پیدا کرتی تھیں' میاں جی کی نظریں آپ ہی آپ راستے کی اچھی اچھی چیزوں پر پڑ رہی تھیں۔ پرانے لاہور کے اردگرد بچے کھچے درختوں کے ہرے پتے ہوا کے ساتھ ناچتے تھے' جیسے کسی چمکیلی دھات کے بنے ہوں' وہ باغ کی روشوں پر چلتے لوہاری' موری' بھاٹی' اور پھر ٹکسالی دروازہ سے اسی صاف ستھرے موڑ میں گزر گئے۔ ان کے بالوں اور کپڑوں میں اتنی خوشبو بسی تھی کہ گندے نالے کی بدبو نے انہیں قطعی پریشان نہ کیا۔

وہ ہمیشہ ٹکسالی دروازے سے ہوتے ہوئے بازار حسن سے کترا کر شاہی مسجد پہنچ جایا کرتے تھے' آج بھی اسی پرانے رستے سے گزرے' پر ان پر قیامت گزر گئی' دینے گوجر کی چھوکری گڈو۔۔۔ یہی کوئی چودہ پندرہ کا سن ہوگا۔۔۔۔ ہاتھ میں پیتل کا قلعی شدہ کٹورا پکڑے' سامنے کی گلی سے نکلتی نظر آئی۔ جیسے دور نزدیک کوئی دیکھنے والا نہ ہو۔۔۔ مگر میاں جی دیکھ رہے تھے۔ انہیں گڈو کا کچا بدن دوپٹے کی سلوٹوں اور سفید وائل کے ڈھیلے کرتے کے نیچے ہمکتا دکھ رہا تھا' گڈو تو کٹورا بجاتی دودھ دہی کی دوکان کی طرف بڑھ گئی مگر میاں جی کا وضو ٹوٹ گیا' وہ وہیں سے اُلٹے پاؤں ہو لیے اور آتے ہی غسل خانے میں گھس گئے۔ ماں نے حیران ہو کر پوچھ لیا۔

"ارے بیٹا! کیا ہوا؟ نماز نہیں ملی؟ تم آ کیوں گئے۔۔۔؟ ابھی تو وقت نہیں ہوا تھا؟"

"ہو گیا۔۔۔ ماں ہو گیا۔۔۔ وقت ہو گیا۔۔۔"

اس دن کا جمعہ اور پھر کئی جمعے انھوں نے گھر ہی میں پڑھے۔۔۔ ہونی شدنی کا کچھ پتا نہیں' کس راستے پر کھڑی مل جائے۔۔۔ سو اب وہ شاہی مسجد پہنچنے کے لیے بازار حسن کو کاٹ کر گزرنے کی بجائے سیدھا سیدھا گزر لیتے۔ یہاں کسی خطرے سے مڈ بھیڑ کا امکان کم کم تھا۔ چوباروں' بالکونیوں میں خال خال کوئی عورت' مرد' بچہ نظر آتا تھا۔ گلیوں میں آدھے سوئے' آدھے جاگے لوگ ملتے تھے۔ کہیں کہیں دہلیزوں میں وحشی سنگنیاں' ناکائیں' اجڑے بال' خاکستری بدن' ان جھاڑیوں کی طرح لگتی تھیں' جو رات بھر گرد بادوں کی زد میں رہی ہوں۔

میاں جی اس بازار سے لاحول پڑھتے نہیں گزرتے تھے۔ اللہ کی بے نیازیوں پر صدقے واری جانے کی جو تربیت انہیں ملی تھی اس پر عمل کرنے کی طرف بھی ان کی طبیعت مائل نہ ہوتی' بس رحم سا آتا اس شہر خوشاں پر' مسجد تک پہنچ کر بالکل ہی بھول بھال جاتے۔ صدر دروازے پر جوتیاں اتاریں' ڈیوڑھی میں اہل بیت کی چیزوں کی زیارت کی' درود بھیجا' پھر مسح کیا اور نوافل شروع کر دیے۔

شاہی مسجد کے خطیب کی تقریر کا ایک ایک لفظ سننے کی کوشش کرتے۔ ذہن میں کئی سوالات اٹھتے تھے' مگر انہوں نے سوال کبھی نہ کیا' شاہی خطیب کی گھمبیر شخصیت انہیں سوال کرنے کا حوصلہ نہ دیتی تھی' کئی بار ارادہ کیا کہ پوچھیں!

"قبلہ و کعبہ! یہ جو آگے پیچھے سے بے خبر بیبیاں ان کوٹھڑیوں چوباروں میں دوزخ کا دھندا کرتی ہیں' شاہی مسجد کے یہ مینارے انہیں اپنے سائے میں کیوں نہیں لے لیتے؟ یہ اتنے بڑے بڑے سفید گنبد ان کی سیاہ بختی کو ڈھانپ نہیں سکتے کیا؟ لائیے! میں پہل کرتا ہوں۔" وہ جوش جذبات میں خود کلامی کرنے لگتے اور ان کے اندر کا عاقل انسان ان کی بلوغت پر غالب آ جاتا۔ میاں جی کے پہل کرنے سے کچھ بھی فرق نہیں پڑے گا۔ ان کی ہیئت اور حیثیت ایک نارمل انسان جتنی بھی نہیں تھی۔ یہاں عام آدمی بھی اگر کوئی کارنامہ سرانجام دے تو اسے قابل تقلید نہیں سمجھا جاتا۔ اس کے من کا مور انسانوں کے جنگل میں اکیلا ناچتا ہے اور ایک لامحدود تنہائی اس کے وجود کا حصہ بن جاتی ہے۔ عام آدمی کا یہ المیہ بھی ہے اور عافیت بھی۔

میاں جی عام آدمی سے بھی نچلے درجے پر آتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اپنا حساب کتاب اس ہستی کے ساتھ جوڑ لیا جو واقعی قادر مطلق ہے' جو ہے کو نہیں میں اور نہیں کو ہے میں بدل سکتا ہے۔ قناعت اور تقویٰ کی تعلیم نے انہیں شانت رہنے میں کافی مدد دی۔۔۔۔ والدین کے دلائل میں میاں جی کو وزن نظر آتا تھا۔ مثلاً وہ کہا کرتے تھے۔

"بیٹا! اگر وہ تجھے اندھا بنا دیتا تو تو اس خوبصورت دنیا کو کیسے دیکھ سکتا تھا؟ کان نہ ہوتے تو تو اتنی پیاری پیاری آوازیں کیسے سنتا! پیر نہ ہوتے تو تو قید ہو کر رہ جاتا اپنی کھاٹ پر'

بالکل محتاج---- اس بے پروا نے تجھے اپنی برکتوں سے نوازا ہے۔ نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کے سامان دیئے ہیں۔"

کہا گیا کہ دنیا جنت کے نمونے پر ہے۔ تو دانہ ء گندم کا اپنا مقام ہے۔ میاں جی کی ماں دانہ ء گندم کی تاثیر سے واقف تھیں' وہ جانتی تھی کہ جان ہے تو ایک جہان آرزو بھی پردے میں جھمگٹا لگائے رہتا ہے۔ کوئی کیا کرے---- میاں جی کو ہو نہ ہو' ماں کو ان کے بیاہ کی فکر آخر دم تک رہی۔

کہتے ہیں' لڑکیوں کو اپنے بھانجے بھانجیاں بے حد پیارے ہوتے ہیں۔ تبھی تو یہ محاورہ بنا کہ ماں جنے یا ماسی' بات ایک ہی ہے۔ بھانجوں کے لیے ماسی کی ممتا ماں سے ایک دو ڈگری کم ہو تو ایک عمر تک تو وہ اپنا رنگ خوب دکھاتی ہے حتیٰ کہ ماسی خود ماں بن جائے۔ یہ ایک بائلوجیکل اور سائیکالوجیکل مسئلہ ہے۔ میاں جی کی ماں نے اپنی چھوٹی بہن کے اس مسئلے سے اچھا خاصا فائدہ اٹھایا تھا۔

ہوا یہ کہ میاں جی کی چھوٹی ماسی بلقیس' جو تقریباً ان ہی کے گھر پلی بڑھی تھی' ہر وقت میاں جی پر صدقے واری جاتی' معصوم بچہ ہر ایک کو پیارا لگتا ہے اور میاں جی تو تھے بھی گورے چٹے' گول مٹول' زیادہ بھاگ دوڑ نہیں سکتے تھے' باقی بچوں سے بچھڑے ہوئے' نوعمر بلقیس کے دل میں ان کے لیے رحم اور ممتا میں بھیگا جذبہ امنڈ امنڈ کر آتا تھا۔ وہ ننھے میاں جی کو سینے سے لگا کر اتنا بھینچ لیتی کہ اگر کمر کی ہڈی لوہے کی بنی ہوتی تو خم نکل جاتا۔ وہ چوبیس گھنٹے بھانجے کے پیار میں شرابور رہتی' میاں جی کی ماں اس کو دیکھ کر خوش ہوتی' اور اللہ کا شکر بجا لاتی کہ دلوں میں محبت اور نفرت کے بیج بونے والا وہی ہے۔

گھر میں بیٹھی رہنے والی عورتوں کی دلچسپی کے موضوعات محدود اور مخصوص ہوتے ہیں۔ ہانڈی روٹی' کپڑا لتا' پھر تان جا کر شادی بیاہ کی باتوں پر ٹوٹتی ہے۔ شادی کے بعد بچے بالوں' پھر وہی ہانڈی روٹی' کپڑا لتا' بیاہ بداع اور اس کے ساتھ لاحقے' یہ باتیں ہر روز' ہر وقت' ہر گھر میں دہرائی جاتی ہیں' مگر ذائقے میں کوئی فرق نہیں آتا۔ عورتیں اس چکر میں بہت خوش رہتی ہیں۔

میاں جی کی ماں البتہ روہانسی ہو جایا کرتی تھی۔

"اور تو سب ٹھیک ہے۔ میرے بیٹے سے بیاہ کون کرے گا؟"

"میں کروں گی آپا! ان شاء اللہ میں کروں گی۔۔۔۔" بلقیس نے ایک دن سینے پر ہاتھ مار کر کہا تھا۔

"تو کرے گی۔۔۔۔؟" ماں کے لہجے میں خوشی اور ناامیدی گڈمڈ ہو گئی تھی۔

"تیرے ساتھ تو شرعاً جائز نہیں"

"ہائے آپا! آپ بھی کتنی سیدھی ہیں" بلقیس نے بلا شرمائے کہا۔ وہ نہایت جذباتی ہو رہی تھی۔ "میرا بیاہ ہو گا نا آپا؟ اللہ کرے پہلوٹھی کی بچی ہو' وہ میرے اس ننھے کی۔۔۔۔ بچی۔۔۔۔ ہاتھ آئے۔" اور اس نے بہن کی طرف وعدے کا ہاتھ بڑھا دیا۔

"وعدہ"

"ہائے بچو! میں صدقے جاؤں۔ تو کتنی اچھی ہے۔" ماں نے بلقیس کا ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگا لیا۔ آنکھیں جو آنسوؤں سے نم تھیں۔

"اللہ تجھے جزا دے۔ تو نے میرا دکھ بانٹ لیا۔ اللہ تعالیٰ تجھے کبھی کوئی دکھ نہ دکھائے۔"

لو جی! دونوں بہنوں کے درمیان عہد ہو گیا' اس پر جس نے کہا آفرین کہا۔

بلقیس کی شادی کی عمر تھی۔ چند برسوں کے اندر اندر ہو گئی۔ اب جو پیدائش کا سلسلہ شروع ہوا تو ہر دوسرے تیسرے برس بیٹا' لوگوں کے حساب کے مطابق بلقیس کے گھر پر اللہ کی مہربانیوں کا مینہ چھاجوں برس رہا تھا۔ بلقیس وعدے پر قائم تھی۔۔۔۔ ہوتے ہوتے تیس برسوں میں بارہ بیٹوں کی ماں بن گئی۔ پر رسول کا سلام نہ آیا۔

اس دوران میاں جی کی ماں نے بلقیس کی طرف سے مایوس ہو کر ادھر ادھر بات چلانے کی کوشش کی' بیل منڈھے نہ چڑھی۔ بلقیس پر سے عمر کی بھری برسات گزر کر بھادوں کا موسم آ چکا تھا۔ میاں جی کی چھدری ڈاڑھی کی فصل پک کر پیلی پڑنے لگی تھی۔ ماتھے کا محراب خاصا نمایاں ہو چکا تھا۔ ٹخنوں پر پڑے سیاہ گٹے لمبی عبادت گزاری کی گواہی دیتے تھے۔ ان کے زہد و تقویٰ میں تو کسی کو شک ہی نہیں تھا۔

انہی دنوں جب بلقیس خالہ پھر امید سے ہوئیں تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ کسی کے لیے اچنبھے کی بات تب ہوئی جب بلقیس نے بیٹی کو جنم دیا۔ ہر سمت حیرت ناک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ بلقیس نے بے وضو کی اسی حالت میں سجدہ کیا اور ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر بلند آواز میں بولی----

"تو شرم رکھنے والا ہے اور تو ہی بھرم رکھنے والا ہے۔ تو ہی وعدوں کے دن مقرر کرتا ہے۔ بندہ نہیں کر سکتا' میں تیری بندی ہوں۔"

اور جب میاں جی کو بچی کے کان میں اذان دینے کے لیے بلایا گیا تو وہ شش و پنج میں تھی کہ میاں جی کا بچی کے کان میں اذان دینا جائز ہے یا ناجائز---- تاہم میاں جی گئے اور نومولودہ کے کان میں اذان کہی اور بعد میں اس کی ماں اور دوسرے عزیزوں کو مبارکباد دی۔ جس طرح دوسرے لوگوں کے گھر میں اذان کے بعد کہا کرتے تھے۔ بلقیس خالہ نے ان کی ہتھیلی پر مٹھائی کے گیارہ روپے رکھے۔ ان گیارہ روپوں میں جانے کس کس شگون کے اشارے بندھے تھے یا کسی عہد پر مہر تھیں یہ گیارہ روپے۔

میاں جی اٹھ کر جانے لگے تو بلقیس خالہ نے بھرائی آواز میں سب کے سامنے اعلان کیا۔

"میں اپنے وعدے پر آج بھی قائم ہوں آپا! میں نے یہ شگن کے روپے رکھے ہیں ہتھیلی پر' بانگ کے نہیں۔"

بلقیس کی نگاہیں اس وقت بوٹی بھر بیٹی پر مرکوز تھیں اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ یہ آنسو تشکر کے تھے یا پچھتاوے کے' مگر لہجے میں خاصا دم تھا' زچہ کے کمرے میں بیٹھا ہر شخص اس کے فیصلے پر دم بخود تھا۔ ان میں بلقیس کی دو نوجوان بہوئیں بھی شامل تھیں' وہ ساس کے پختہ عزم کی داد دینے کے بجائے ششدر تھیں۔

"تم لوگ حیران کیوں ہو؟ یہ نبیؐ کی سُنّت ہے۔" بلقیس نے اپنے فقرے کے آخری حصے کو بار بار دہرایا جیسے خود کو باور کرا رہی ہو۔ بلقیس سے زیادہ بلقیس کا شوہر مطمئن اور سرخرو نظر آتا تھا۔

میاں جی خالہ کے گھر سے لوٹے تو عجب کیفیت تھی ان کی۔ گویا زمین و آسمان کے

درمیان معلق ہوں' ہوا کے دوش پر چل رہے ہوں' بالکل غیرمادی اور غیر مرئی سا احساس "ہے اور نہیں" کے درمیان "ہونے اور نہ ہونے" کے بیچ۔۔۔۔ کیا انسان کے بس میں سب کچھ ہے؟ کیا وہ اپنے لیے فیصلوں' حیلوں بہانوں کا خود ذمہ دار ہے؟ یہ کھیل کیا ہے؟ کیا یہ ڈرامہ مرد عورت کے بغیر مکمل نہیں؟ کیا انسان کی پیدائش اور پوری زندگی اس ایک منظر پر موقوف ہے؟ سارے مذاہب عالم' تاریخ کے تمام پیچ و خم' تہذیب و تمدن کے جملہ مراحل کی آخری منزل بس ایک عورت اور مرد کا ملاپ اور کچھ نہیں۔۔۔۔ محض وقفہ سوالات ہے!

میاں جی اس روز بہت الجھے۔ دل و دماغ میں دھماکے ہوئے۔ ذہنی جنگ و جدل کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج انہوں نے ساری نمازیں قضا پڑھیں' لمبے سجدوں میں شرمندگی کا عنصر بڑھ گیا۔ جب تھکن سے اونگھ گئے تو ایسی گہری نیند آئی کہ بس۔ کلفتیں دور ہو گئیں۔

اس سے پیشتر کہ ماں دور نزدیک مٹھائی تقسیم کر کے منگنی کا اعلان کرے' میاں جی نے انکار کر دیا' ماں کی امیدوں کا سجا سجایا محل دھڑام سے زمین پر آ رہا۔ وہ اس کے ملبے کے نیچے دبی' کراہ کر بولی:

"تو گھر آئی مایا کو ٹھکراتا ہے۔ ارے تو کیسا مولبی ہے کہ سنت سے منہ موڑتا ہے!"

"نہیں ماں نہیں! ایک بار نہیں کروڑ بار نہیں! تو مجھے عقیدے اور عقیدے کے فریب میں نہ ڈال۔۔۔۔ اگر یہ گناہ ہے تو وہ غفور الرحیم ہے۔ میں اس کی ذات سے مایوس نہیں۔"

"جنازہ جائز ہو جائے گا بیٹے! لڑکیاں کڑوی بیل کی طرح پلک جھپکتے میں چودہ سال پار اور لڑکی تیار۔۔۔۔"

"مجھ سے ایسی گندی باتیں نہ کر ماں!" اور پھر میاں جی نے برسوں کا حساب جوڑ کر ماں کو سمجھانا چاہا۔ "جب منی چودہ برس کی ہو گی میں پچپن برس کا ہو جاؤں گا۔ نہیں نہیں میری توبہ!" انہوں نے کانوں کی لوؤں کو ہاتھ کی چٹکیوں سے پکڑ کر دو تین جھٹکے دیے۔

"ارے تو کیسا مرد ہے؟ اور کوئی ہوتا تو رال ٹپکنے لگتی۔۔۔۔"

"مجھے نامرد ہی سمجھ اور معاف کر بس" اس لمحے میاں جی کو اپنی ماں دنیا کی مکروہ ترین عورت دکھائی دی۔ نہ صرف ماں بلکہ دنیا کی ہر عورت نہایت پست' ناقص العقل اور ندیدی تھی' ان کی نگاہ میں ان کی تینوں بہنیں' چاروں بھابیاں' بلقیس خالہ اور بھائیوں بہنوں کی بیٹیاں' سب کی سب ایک صف میں بے لباس کھڑی تھیں' جیسے چڑیلیں اور بھتنیاں ان کے تقدس کے پندار کو پارہ پارہ کرنے کے لیے پرے باندھے ہوئے ہوں۔ ان سب کی آنکھوں میں ہوس کے شعلے لپک رہے تھے۔ اور دہانوں سے موہ مایا کی رال ٹپک رہی تھی۔ یہ اس کی مائیں' بہنیں' بیٹیاں' بھانجیاں' بھتیجیاں نہیں تھیں' اب تک کے رشتوں کا حال یہ تھا کہ سب عورتیں تھیں' فقط عورتیں' ماں کے انگیخت زاویے نے میاں جی کے دل میں عورت کے ادب و احترام کے بخیے کچھ اس طرح ادھیڑے کہ ہر رشتہ ننگا ہو کر عورت رہ گیا۔ ایک بوئی جتنی بچی بھی عورت تھی' کچھ ہی برس میں اس بوٹی کو زیور کپڑے کا نمک مرچ لگا کر رسموں رواجوں کی آگ پر خوب سیک بھون کر تیار کر دیا جائے گا تاکہ میاں جی کے نفس کی بھوک کو مٹا سکے۔ میاں جی ایسے روزہ دار تھے جن کے افطار کا بندوبست گویا معاشرے کی ذمہ داری تھی۔

میاں جی سوچ سوچ کر بہت الجھے۔ بہت تجزیے کیے۔ مردوں کو عورتوں پر کس لحاظ سے فوقیت حاصل ہے؟ شاید اس لحاظ سے کہ عورت جنس کے معاملے میں بہانہ ساز ہے۔ انحراف کے مقابلے میں اعتراف کے پہلو کو نمایاں نہیں ہونے دیتی' اس کی بات کا اسی لیے آدھا وزن بھی سمجھا جاتا ہے۔ وہ دوہری ہے اور یہی دوہرا پن اس کا آدھا پن ہے۔۔۔۔ عورت ماں ہے۔۔۔۔ مگر عورت ہے۔ بہن اور بیٹی ہے' پھر بھی عورت ہے۔ عورت کے خلاف نفرت سے میاں جی کا جی ایسا بھر گیا کہ ابکائی آنے لگی۔ جانے یہ کس عمل کا رد عمل تھا۔ بظاہر ماں نے ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت آئندہ پروگرام کی تجویز اس کے سامنے رکھی تھی' وہ یہ دلیلیں بھی دیتی تھی کہ بہن بھائی اپنی اپنی گھرداریوں میں مگن ہیں' میرے آنکھ میچتے ہی دیکھنا کیا ہوگا۔۔۔۔ کوئی رک کر نہ پوچھے گا بھوکے ہو یا پیاسے۔۔۔۔ ان کو رحم آئے گا تو ٹکڑا ڈال دیں گے۔۔۔۔ گھر' گھر والی سے بنتا ہے۔

میاں جی کو روٹی ٹکڑے اور گھر کی کیا پروا۔۔۔۔ ایک پرائمری سکول میں نائب قاصد کے طور پر ملازمت مل گئی تھی۔ صبح شام دو تین گھروں میں بچے بچیوں کو کلام مجید پڑھا دیتے۔ چائے پانی' روٹی کپڑا اللہ کے بندے کو مل جاتا۔ فکر کاہے کی؟ انسان کو زندہ رہنے کے لیے دو وقت کی روٹی' ستر ڈھانپنے کو کپڑا اور سر کے اوپر چھت چاہیئے۔ باقی سب بکھیڑے ہیں' جھگڑے ہیں' جھمیلے ہیں۔ ماں تھی کہ انہیں ان بکھیڑوں میں پھنسانے پر مصر تھی' تقاضا زیادہ بڑھا تو وہ اپنا بوریا بستر اٹھا کر مسجد کے حجرے میں چلے گئے۔ تنہائی' یکسوئی میسر آئی تو تفسیر و احادیث کا مطالعہ کیا' پر ذہن میں اٹھنے والے سوالات کی تشفی نہ ہوئی۔ ہر مفسر الجھاتا تھا۔ احادیث کی صحت کے مسئلے نے خاصا پریشان کیے رکھا۔ آخر یہی سوچا کہ صرف اللہ اللہ کرنا اور برے خیال و اعمال سے اجتناب ہی فلاح کا راستہ ہے۔ یا پھر دوسروں کی خدمت' خدمت میں جو سکون ملتا ہے کہیں نہیں' سارے مذاہب کی بنیادی قدر انسانی خدمت' اس کی فلاح اور بقاء ہے۔

معاشرے میں رہتے انسانوں کے ساتھ روادار رویئے کو میاں جی نے کبھی نظر انداز نہیں کیا تھا۔ اسی ایک نقطے پر ان کا فلسفہ حیات استوار تھا۔

گزشتہ کئی برسوں سے وہ اپنی قلیل تنخواہ میں سے ضرورت مند اور یتیم بچوں کی فیس مستقل ادا کر رہے تھے۔ مستحق بچوں کی سفارش کر کے اسکول میں بھرتی کروا دیتے' ناداروں کی داد رسی کرتے' بیماروں کے لیے دم درود کرتے' اس قسم کے کاموں کے بدلے انہیں اپنے ہونے کی شہادت ملتی تھی' اپنے علم' مشاہدے اور تجربے کی بنا پر دوسروں کی اخلاقی مدد اور مشورے کی اہلیت بھی رکھتے تھے۔ لوگ بھی ان پر اعتماد کرتے تھے۔ بلاشبہ وہ کردار کے لحاظ سے اپنے حلقے میں مقبول شخصیت بن گئے تھے۔

میاں جی ساٹھ برس کی عمر میں ریٹائر ہوئے تو بلقیس خالہ کی بیٹی دلدار بیگم دو بچوں کی ماں تھی اور اپنے شوہر کے ساتھ کینیڈا میں رہنے چلی گئی تھی۔ ان کی خوشحالی اور خوش و خرم زندگی کی کئی شہادتیں تھیں۔ پہلی تو یہی کہ وہ دونوں پہلی نظر میں ایک دوسرے پر فریفتہ ہو گئے تھے۔ پھر جونہی ڈاکٹر صفدر علی کی طرف سے دلدار بیگم کے لیے پیغام آیا فوراً

قبول کر لیا گیا۔ حالانکہ دلدار بیگم اس وقت صرف سیکنڈ ایئر میں پڑھتی تھی اور صفدر علی ایم۔بی۔بی۔ایس۔ کے آخری سال میں تھا۔ ستاروں کا میل ایسا ہوا کہ جونہی دلدار' صفدر سے منسوب ہوئی صفدر علی کو دن دگنی رات چوگنی ترقی ملتی گئی۔ شادی کے اگلے برس اسے کینیڈا سے آفر آگئی۔ چند ماہ کے اندر اندر اس نے بیوی بچوں کو بھی بلا لیا۔ اب وہ وہاں سے عید بقرعید پر اپنی تصویریں اور تہنیتی کارڈ بھیجتی تو بلقیس خالہ خوشی سے پھولی نہ سماتی اور سارے رشتہ داروں کو دکھاتی پھرتی۔

"دیکھو! کیسی جوڑی ہے! شالا نظر نہ لگے۔ کسی نے سچ کہا کہ رشتے تو خدا کے گھر میں ہی ہو جاتے ہیں۔"

یہ حقیقت ہے کہ بلقیس خالہ نے میاں جی کے انکار کے بعد جھوٹے منہ سے بھی اصرار نہ کیا تھا۔ کہ "آپا آپ کی امانت میرے پاس ہے۔ بیٹے کو مناؤ اور لے جاؤ۔" اس نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا ہوگا۔ البتہ ماں کو مرتے دم تک قلق رہا۔

ماں جب تک زندہ رہی میاں جی نے جی جان سے خدمت کی۔ ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔ اس جنت کے حصول کے لیے جدوجہد کرنا ان کی عین خوشی تھی' عبادت تھی۔ کئی بار عزیزوں نے میاں جی سے حج کی سعادت حاصل کرنے کے لیے کہا' لیکن وہ صاف انکار کر دیتے۔۔۔۔

"نہ جی نہ۔۔۔۔ میری ماں ضعیف ہے۔ اس کی خدمت ہی میرا حج ہے۔"

اس فریضے کو انھوں نے ہمیشہ مقدور بھر احسن طریقے سے سرانجام دیا۔

جب ماں اللہ کو پیاری ہوئی تو فریضہ حج کو اپنے اوپر لازم جانا۔ ادھر ریٹائرمنٹ کے بعد پراویڈنٹ فنڈ اور انشورنس سے خاصی معقول رقم جمع ہو گئی۔ اب حج کے لیے جانے پر کوئی ذمہ داری ان پر فائق نہ تھی۔ درخواست دیتے رہے۔ چوتھے سال قرعہ اندازی میں نام نکل بھی آیا۔ اب ان کی عمر چونسٹھ برس تھی۔ صحت مجموعی طور پر اچھی تھی کہ عمر بھر ذہنی اور جسمانی آلودگیوں' جان لیوا لذتوں سے خود کو محفوظ رکھا۔ مالی لحاظ سے بھی ناآسودہ نہیں تھے کہ قناعت پر یقین رکھتے تھے۔ قناعت کے مسلک نے انھیں روحانی اور جسمانی ہر دو رخوں سے استقامت اور صحت سے ہمکنار کیا۔ لہٰذا تمام مناسک حج ادا کرنے کے لیے وہ خود کو چاق و چوبند پا رہے تھے۔ کملی والے کی گلیوں کے دیدار کی خوشی نے ان

کے جسم میں بجلیاں بھر دیں۔ وہ شوق کے سحر میں ایسے دوڑے بھاگے پھرتے تھے کہ الفاظ ان کی تصویر کشی کرنے سے قاصر ہیں۔ اپنی روحانی کیفیت کو وہ خود بیان نہیں کر سکتے تھے۔ بس بڑبڑا کر رہ جاتے۔

"بلایا ہے۔۔۔۔ بلایا ہے۔۔۔۔ مجھ ناچیز کو تاجدار انبیاء نے بلایا ہے۔۔۔۔ میں خدا کے گھر میں جا کر دعا مانگوں گا؟ رسولؐ کے روضے پر جا کر کیا کہوں گا؟ یہ دنیا جس کے لیے لوگ وہاں رو رو کر دعائیں مانگتے ہیں میری نہیں' میرے لیے نہیں۔۔۔۔ ہاں! یہ استدعا ضرور کروں گا کہ اللہ مجھے کسی کا محتاج نہ کرنا' میرے دل کو اپنی یاد سے خالی نہ کرنا' جتنی زندگی ہے اس میں تیرے بندوں کی محبت سے دل غافل نہ ہو' آخرت اچھی ہو' خدایا۔۔۔۔ اچھی ہو۔۔۔۔"

ان کے حج پر جانے کے چرچے عام ہوئے تو عزیز' رشتہ دار' جاننے والے' حاجت مند اور اللہ والے ملاقات کے لیے آنے لگے۔ لوگ آتے' اپنی اپنی خواہشات اور تمناؤں کے بار تلے دبے' اپنی ذات کے بندے۔۔۔۔ حال پوچھنے کے ساتھ شروع ہو جاتے :

"میاں جی! خانہ خدا میں کھڑے ہو کر مجھے بھول نہ جانا۔۔۔۔ میرے لیے دعا کرنا۔۔۔۔ میرے لیے گڑگڑا کر کہنا" چند ہی روز میں ان کے پاس اتنی دعائیں اور فرمائشیں جمع ہو گئیں کہ آپس میں گڈمڈ ہو جاتی تھیں اور میاں جی بھول جاتے تھے کہ کونسی دعا کس کے لیے تھی' سٹ پٹا کر ایک نوٹ بک میں نوٹ کرنے کا مشورہ مان لیا' اب مع نام پتہ' رشتہ' نوعیت دعا اور اہمیت کے اعتبار سے ترجیحی تقسیم بھی کر لی' ان کے بھانجے نے یہ سارا کام اپنے ذمے لے لیا اور میاں جی کے سیکرٹری برائے مناجات و دعا کے فرائض احسن طریقے سے انجام دیتے ہوئے گائڈ بھی کرتے جاتے تھے۔ "یہ دعا اس طرح پڑھنا ماموں جان۔۔۔۔ اس کو بعد میں۔۔۔۔ لے لینا۔۔۔۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

بھتیجیوں بھانجیوں نے سعودی عرب سے سوغاتیں لانے کے لیے فرمائشیں کیں تو ان کی بھی فہرست مع نام اور اہمیت تیار ہو گئی۔ یہ سب کام میاں جی کی عین خواہش کے مطابق ہو رہے تھے۔

ایک دن ان کا ایک بہت ہی پرانا جاننے والا شخص جس کا نام میاں جی کو یاد تھا' اختر' انہیں ملنے کے لیے آ پہنچا' میاں جی اسے مل کر بہت خوش ہوئے۔ کسی زمانے میں انہوں نے اس کی کفالت کی تھی' بعد میں ایسا غائب ہوا کہ اب حج پر جانے کے موقع پر آیا۔ میاں جی نے دل میں سوچا کہ یہ اللہ رسول کا کھرا بندہ جو اتفاق سے ایسے وقت پر آیا کہ جب وہ سب کی دعاؤں کی فہرست بنا رہے ہیں۔ وہ ضرور اس کے لیے بھی خلوص دل سے دعا کریں گے۔۔۔۔

بعض لوگ تمام عمر لینے والا ہاتھ دراز رکھتے ہیں اور کچھ نہ کچھ لے' کھینچ کر نکلتے ہیں۔ بعض ایسے ہوتے ہیں کہ لینے کا منہ نہیں رکھتے' داتا بننے کی دھن سوار رہتی ہے۔ اختر اور میاں جی کا تعلق بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

رمضان کا مہینہ تھا۔ افطاری کے وقت مسجد میں روزہ دار جمع تھے۔ میاں جی کے ایک شاگرد نے لاؤڈ سپیکر پر روزہ افطار کرنے کا اعلان کیا۔ دوسرے نے اذان دی۔ کھجوروں سے جلدی جلدی روزہ کھولا۔ شربت پانی کے دو چار گھونٹ حلق میں انڈیلے' نماز کے لیے جماعت کھڑی ہوئی تو اختر جماعت میں شامل تھا۔ میاں جی امامت کرا رہے تھے۔ نماز مغرب سے فارغ ہوئے تو اختر نے میاں جی کو حجرے میں چلنے کی درخواست کی۔

"ایک گزارش ہے میاں جی۔۔۔۔" اس نے تقریباً بچھتے ہوئے لجاجت کے ساتھ کہا۔

"کیوں بھئی کونسی ایسی بات ہے کہ جو یہاں نہیں ہو سکتی؟" میاں جی نے از راہ تفنن کہا۔ دل میں انہیں یقین تھا کہ اختر کو پھر پیسوں کی ضرورت آن پڑی ہو گی۔ طویل عرصے کی غیر حاضری کے بعد اسے ایسی جرأت تو نہیں ہونی چاہیئے۔ بہرحال جو کہیں بھاری رقم کا مطالبہ کر لیا تو پورا نہیں کر سکوں گا۔ میاں جی اس وقت اس پوزیشن میں نہیں تھے۔ حج کے سلسلے میں کل پونجی جمع کرا چکے تھے۔ آئندہ کا اللہ مالک۔ اسی شش و پنج میں اور قیاس آرائیاں کرتے وہ حجرے کے اندر چلے گئے۔ اختر ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ آرام تسلی سے بیٹھ چکے تو اختر کچھ سنبھل سینت کر الفاظ جوڑتے اور کھنکھارتے ہوئے رازداری سے بولا:

"میاں جی! آپ سے اور صرف آپ سے ایک آس ہے۔"

"کہو تو سہی۔۔۔۔ کھل کر بات کرو۔"

"میاں جی---- میری دور کی ایک پھوپھی ہے۔ حج کے لیے ان کا نام نکل آیا ہے۔"

"بہت خوب---- مبارک خبر ہے۔"

"بندوبست نہیں ہو رہا ناں جی----"

"پیسے پورے نہیں؟"

"نہیں جی"

"تو پھر کیا اڑچن ہے؟"

"جی کوئی محرم نہیں ملتا۔"

"کیا مطلب----؟ میں سمجھا نہیں---- بول---- بول----"

"جی میرا مطلب ہے ان کا کوئی محرم نہیں۔ حج کیسے ہو گا؟"

"شوق انہیں بہت ہے؟"

"جی ہاں----"

میاں جی کو پورا یقین تھا کہ وہ اس مسئلہ پر کوئی دینی حوالہ چاہتا ہو گا' کوئی فتویٰ---- کوئی شہادت---- کوئی رعایت وغیرہ---- لیکن وہ نماز کی امامت کرانے کے باوجود خود کو اس منصب پر نہیں سمجھتے تھے کہ کوئی فتویٰ جاری کر سکیں۔ پھر ان کے فتویٰ کو کون معتبر جانے گا---- وہ کچھ دیر چپ چاپ گردن نیوڑھائے سوچتے رہے---- پریشانی یہ تھی کہ اختر کی مشکل کو کیسے حل کیا جائے۔ ان کے بس سے تقریباً یہ بات باہر تھی۔ وہ اسے کس فتویٰ فروش مشہور و معروف مولوی کے پاس بھیجیں؟ وہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ ایک ایک عالم دین کو ذہن میں لاتے رہے کہ اختر پھر گویا ہوا۔

"میاں جی! آپ قطعی پریشان نہ ہوں۔ تمام انتظامات ہو چکے ہیں۔ زاد راہ اور اخراجات کے لیے اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ بیچاریوں کے پاس' صرف ایک محرم نہیں ہے۔ بیچاریاں بچپن میں بیوہ ہو گئی تھیں ناں! تب سے ہی خود کو اللہ رسول کے عشق میں لگایا۔ اب عشق بلاتا ہے---- پر بیچ میں محرم والی کھنڈت سے معاملہ چوپٹ ہوتا دکھ رہا ہے---- میاں جی---- میاں جی----" اختر ہکلانے لگا---- "آپ نے مجھ سے ہمیشہ مروت برتی ہے۔ آپ ان بیچاریوں کے محرم بن جائیں---- کچھ نہ کریں---- نکاح کر لیں---- بس"

میاں جی پر کپکپی طاری ہوگئی۔ ان کا کمزور دل پسلیوں کے ساتھ ٹھک ٹھک بجنے لگا۔ ماتھے پر آئے نامعلوم عرق کو انگوٹھے سے صاف کیا۔۔۔۔ اچانک انہیں سالہا سال کا وہ جمعہ یاد آگیا۔ جب دینے گوجر کی لڑکی گندو چھلے سے کٹورا بجاتی' بدن اچھالتی ان کے پاس سے گزری تھی اور وہ بے وضو ہوگئے تھے۔ آج وہ بے وضو نہیں ہوئے۔ کافی دیر خاموش رہے تو اختر کو بے چینی ہوئی۔

"میاں جی! میں ان کے کہنے پر آیا ہوں۔ ان کی خواہش سے آیا ہوں۔ آپ نے ہمیشہ میری دستگیری کی ہے۔ آج بھی ناںہ نہ کیجیے گا۔ انہیں مجھ پر مان ہے اور مجھے آپ پر۔"

اختر نے میاں جی کے گھٹنے پکڑ لیے اور آنکھیں ان کی آنکھوں میں گاڑ دیں' میاں جی اس کی نظروں کی تاب نہ لا سکے اور آنکھیں موند لیں۔ ان کے ہونٹ ہل رہے تھے جیسے لاحول پڑھتے ہوں۔

کئی ثانیے گزر گئے۔۔۔۔ پھر آہستہ سے بولے۔

"پرسوں روزہ کشائی کے وقت آنا۔۔۔۔ سوچ کر جواب دوں گا۔"

تیسرے روز اختر حسب وعدہ افطار کے وقت مسجد میں پہنچا تو دیکھا مسجد میں ایک جنازہ تیار رکھا ہے۔ لوگ مغموم چہرے لیے اس کے گرد اذان کا انتظار کر رہے ہیں۔ اختر کے پوچھنے پر کسی نے بتایا۔۔۔۔

"میاں جی گزر گئے۔۔۔۔ آج سہ پہر چار بجے۔۔۔۔ بیمار ہوئے نہ دکھ بتایا۔ نماز عشاء سے پہلے پہلے تدفین ہے۔" وہ رو دیا۔ ایک دوسرے شخص نے اختر کا کاندھا ہلا کر کہا۔۔۔۔

"آپ بھی جلدی جلدی وضو کر لیں' افطاری کا وقت ہوا چاہتا ہے۔"

وضو کرتے ہوئے اختر ایک احساس شکست کے ساتھ سوچ رہا تھا اور بڑبڑا رہا تھا۔

"آخر میاں جی کو ایسی کیا جلدی تھی۔۔۔۔ واپس آ کر مر لیتے۔"

OOOOO

دادی زہرہ

زہرہ دادی تم پر سلام ہو۔ میں تم پر فخر کرتی ہوں۔ تم کو یاد کرنا اور یاد رکھنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ یہ قرض ہے' اپنے بزرگوں کا احترام اور محبت میرے خیال میں ہر ذی شعور انسان پر ایک طرح کا قرض ہی ہوتا ہے۔ اس قرض کی ادائی انسان کا فرض اور ذمہ داری ہوتی ہے۔ یہ چھوٹوں کے حق میں بہتر ہے۔ کل ان کو بھی تو بزرگ ہونا ہے۔

زہرہ دادی! میں نے اپنے بزرگوں کو آپس میں باتیں کرتے سنا ہے۔ آپ کا حج کے لیے جانا ایک چونکا دینے والا Event اکثر اُن کی گفتگو کا محور بن جاتا۔ یہ محور مجھے اس وقت بھی حیران کرتا تھا جب میں فقط چھ برس کی تھی اور اماں مجھے سکول میں بھرتی کرانے کا پروگرام بنا رہی تھیں اور آج بھی یہ محور میرے لیے محور ہی ہے جب کہ مجھے سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوئے سات برس ہونے کو آئے ہیں۔ زہرہ دادی! تیری یاد کو سلامتی ہو----- دادی! حج کی خواہش ہر صاحبِ ایمان مسلمان کی پاکیزہ تمنا ہے۔ لوگ لاکھ کہیں کہ یہ تمنا رواجی ہے یا سماجی----- تمنا' تمنا ہوتی ہے۔ خواہ رواجی ہو یا سماجی۔ میرے نزدیک تو یہ زندگی کی حلاوت اور حرارت ہے۔ ایک سماج میں رہتے ہوئے' اُس سماج کے رسم و رواج کو اپنانا ہی پڑتا ہے اور اپنانا چاہیے ورنہ سمجھدار لوگوں کے بقول آدمی مس فِٹ ہو جاتا ہے۔ مس فِٹ انسان کو زندگی سے انتہائی پیار کے باوجود آغازِ زندگی سے

اختتامِ زندگی تک کا سفر کرنا خاصا دشوار رہتا ہے۔ عورت کے لیے تو کسی سماج کو تھام کر چلنا نہایت ضروری ہے ورنہ اُس کے لیے جینا خاصا کٹھن اور مشکل ہے۔ وہ اس سماج کی بنیادوں کی ایک بہت بڑی ضمانت بن کر جیے تو ٹھیک۔۔۔۔ عزت بھی کماتی ہے اور محفوظ بھی رہتی ہے۔

دادی اماں! تم اپنی ہی مثال لے لو۔ تمام ٹھاٹ اور ٹھسکے کے باوجود لوگ ہمیشہ تمہاری پیٹھ پیچھے کھسر پھسر کرتے تھے۔ ایک قابلِ نفرت کٹھ بد ہونے لگتی تھی۔ تم جانو دادی ماں' حساس بچوں کو لوگوں کی ایسی باتیں بہت تس نس کرتی ہیں۔ بہت زیادہ اُدھیڑ بن میں مبتلا کر دیتی ہیں۔

اصل میں ہم سب اپنے اپنے سماج کے اسیر ہیں۔ اسیری میں ہی بھلا پاتے ہیں کیوں کہ شاباش جو ملتی ہے۔ شاباش ملتی رہے تو انسان اپنی ڈگر پر مستحکم ہوتا ہے۔ جو بغاوت کرے' گنہ گار کہلاتا ہے۔ جیسے تم دادی ماں!

لوگوں کی کانا باتی نے دادی زہرہ مجھے یہی نتیجہ نکالنے دیا۔۔۔۔ کہ تم۔۔۔۔ کہ تم دادی اماں۔۔۔۔ کچھ نہ ہی پوچھو۔ وہ تو شکر ہے کہ تم میری سگی دادی نہ تھیں۔ اللہ بخشے میرے باوا کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔۔۔۔ باوا تمہیں ایسے مانتے اور منواتے جیسے تم ہماری سگی دادی ہو۔ نہ معلوم اُنہوں نے تمہارا وہ گناہ کیوں دھڑتے سے نظرانداز کر دیا تھا۔ تم سے ملتے تھے اور اپنے بچوں کو فخر سے ملواتے تھے تمہارے ساتھ۔

مجھے وہ عید نہیں بھولتی اور بھولے بھی کیسے۔ تم اُس وقت لوگوں کے کہنے کے مطابق سو برس کی تھیں مگر کاٹھی اچھی تھی۔ تم نے اپنے ہاتھ پاؤں میں مہندی رچائی تھی۔ بالوں کو تو لال مہندی نے شفق کا گالا کر دیا تھا' اوپر سے لال ساٹن کا جوڑا' لال ریشمی دوپٹہ۔ بالوں میں لال پراندہ اور پاؤں میں صرف ایک ریشمی پھندنے والا لال سراجو جوتا۔ اللہ رے' دادی ماں تم بالکل پرانے جنڈ کا دہکتا ہوا انگارہ لگ رہی تھیں۔ تمہاریں بھوویں ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دھیرے دھیرے مسکراتی ہوئی چمکیں۔ ہم جو تمہارے ہاں عید مبارک کہنے گئے تھے' باوا کے ساتھ۔

"دیکھا۔۔۔۔ اپنی دادی کو۔۔۔۔ کیا بہروپی بنی ہیں آج! ہیں نا؟"

تمہاری چھوٹی بہو نے سرمئی رنگ کا قیمتی بنارسی جوڑا پہن رکھا تھا۔ ماتھے پر جھومر اور ٹیکا بھی لگا تھا' وہ تمہیں دیکھ کر یوں ہنسی دبا رہی تھیں جیسے تم مضحکہ خیز تھیں۔ اُس نے دبے لفظوں میں کہا بھی۔۔۔۔ "بوڑھی گھوڑی' لال لگام۔۔۔۔"

ہم بچوں کو تو بالکل ہنسی نہیں آئی۔ عید تھی' موقع تھا' کوئی کچھ بھی پہنے۔ حالانکہ وہ خود سرمئی سوٹ میں' ماتھے پر جھومر لٹکائے بالکل گدھی لگ رہی تھی۔ نتھنے پھڑپھڑاتی' پھُرر پھُرر ہنسی کو دباتی سربسر گدھی۔

تم اس عمر میں بھی اپنی ہنڈکلیا الگ رکھتی تھیں۔ بلکہ ایک الگ گھر' ایک مکمل اسٹیبلشمنٹ تھی۔ الگ ملنا جلنا۔ اپنا لین دین' دُنیاداری' طور طریقہ۔ آج بھی مجھے حیرت میں جتلا کر دیتا ہے۔ تم کیسے کر لیتی تھیں یہ حساب کتاب؟ نماز پڑھتی ہوئی بھی تم پائی گئیں. عید کے دن جب ہم عید ملن کے لیے جاتے تھے' سنتے تھے تم نماز عیدین ادا کرنے قریب کی جامع مسجد میں گئی تھیں۔ تم ہمت ہی ہمت تھیں دادی! ہاں ایک بات جو میں اب بھی سوچتی ہوں کہ یوں تو گھر کی ایک ایک چیز سلیقے سے اپنی اپنی جگہ پڑی ہوتی تھی مگر ان پر گرد کی دبیز تہیں جمی رہتی تھیں یہاں تک کہ تمہارے شوہر کا قد آور پورٹریٹ بھی سر سے لے کر پاؤں تک گرد آلود تھا۔ فرنیچر' میز' کُرسیاں' سجاوٹ کے خوبصورت برتن اور گلدان سب اس بات کی گواہی دیتے تھے کہ کافی دنوں سے اس طرف توجہ نہیں دی گئی اور تمہاری وہ بیٹھک' جسے اب ہم ڈرائنگ رُوم کہنے لگے ہیں' جس میں دادا جی کا پلنگ مع کشیدہ کاری والا پلنگ پوش ہمیشہ بچھا رہتا تھا۔ اُس کے گاؤ تکیوں پر چھپکلیوں کی چھپاچھپ تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی۔۔۔۔ آخ تھو۔۔۔۔ ایسا تو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ صفائی کا کام تو بہوویں بھی کر سکتی تھیں۔ لگتا ہے انہیں تمہاری دُعائیں درکار نہ تھیں اور پوتے پوتیاں۔۔۔۔! وہ بھی اپنی ماؤں کے بچے تھے۔

ڈر کے مارے ہم بیٹھک کی طرف جاتے ہی نہیں تھے۔ بے شک تم نے بڑے سے پنجرے میں رنگ برنگ پرندے پال رکھے تھے۔ تمہارا لاڈلا میاں مٹھو برآمدے کی محراب

میں جھولا کرتا تھا۔ تمہاری خانہ داری اور باورچی خانے کا بھرم خوب تھا۔ تم عید کے دن بھی آنے والوں کو سبز چائے اور حلوہ پیش کیا کرتی تھیں۔ سویاں یا کچھ اور چیز نہیں---- ساتھ یہ فقرہ بھی ضرور دُہراتیں :

"کیا کروں؟ حلوہ بنانا آسان ہے----"

اور تمہاری کوئی نہ کوئی بہو جو مہمانوں کے ساتھ ہی بیٹھی ہوتی تھی کھسرا پھسرا کے ہمارے کانوں میں تمہارے بارے میں اطلاع ڈالتی تھی :

"بڑھیا کسی کو قریب بھی پھٹکنے دے تو نا! بڑی طمع ہے---- پاؤں قبر میں' دل ابھی تک دُنیا میں رہتا ہے۔ اب نوکرانی جتنا چاہتی ہے کر دیتی ہے۔"

اور دادی زہرہ! تم بغیر کسی ردّ و کد کے کہا کرتی تھیں :

"دوسرے سے تو آدمی تنکا بھی نہ اُٹھوائے۔ جب تک ہاتھ پاؤں چلتے ہیں کام کرنا چاہیے۔"

تمہیں بہوؤں' پوتوں' پوتیوں کی شکایت شکوہ کرتے کبھی نہیں سنا بلکہ تمہارے پوتے تمہاری رسوئی میں کھانے پینے کی چیزیں تلاش کرتے ہوئے چھوٹی موٹی ڈانٹ ڈپٹ کی پروا بھی نہیں کرتے تھے۔ مگر ان کی مائیں' اپنے گھر میں بیٹھی' چلا چلا کر کہتی رہتیں----

'مت تنگ کرو دادی کو---- بے چاری کو جتنی اُوپر والے نے دی ہے وہ تو بھوگے گی---- اللہ کے راندوں کی عمریں لمبی ہوا کرتی ہیں۔'

آگے سے تم کچھ بھی نہ کہتیں۔ کیسی ساس تھیں تم۔ کہتیں تو صرف اتنا "اللہ معاف کرے۔ بے چاری ناتجربہ کار ہیں۔"

مگر زہرہ دادی! مجھے آج بھی یقین ہے کہ تم زندگی بھوگ نہیں رہی تھیں۔ تم تو بڑے طمطراق سے زندگی بسر کر رہی تھیں۔ تم نے گھر کے اوپر کے کام کاج کے لیے بلاشبہ ملازمہ رکھی ہوئی تھی مگر اپنا کھانا تم خود پکایا کرتی تھیں۔ حالانکہ تمہارے چار بیٹے تھے۔ سبھی گھر بار والے' اولاد والے۔ اپنی طرف سے تم نے ان سب کے حصے چُکا دیے تھے۔ بڑا بیٹا' تایا غلام مصطفیٰ۔ سربسر سفید پوش' نہایت پرہیزگار' دبا دبا سا۔ دوسرا بیٹا' تایا غلام دستگیر' کسی

دفتر میں ملازم تھا۔ اُس کے پاس ہمیشہ نئی سائیکل ہوتی تھی، چمکتی ہوئی، جس کی گھنٹی بجانے کے لیے ہر بچہ داؤ پر رہتا۔ چوری چوری کھسک جاتا۔ مگر جب ٹرر، ٹرر ہوتی تو پکڑا جاتا۔ تم منع کرنے کے انداز میں فقط یہ کہتیں :

"نہیں جانتا، شور سے پکڑا جائے گا۔ بچہ ہے نا!"

یہ دونوں بیٹے تمہاری حویلی ہی کے مختلف گوشوں میں رہتے تھے۔ تم نے یا ہمارے دادا نے حویلی کا بٹوارہ بڑے طریقے اور سلیقے سے کیا تھا۔ صحن میں واقع کنویں کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر کے دونوں طرف دیوار کھینچ دی تھی۔ دیوار کے اس پار صحن کے بڑے حصے میں تمہارے بڑے دونوں بیٹوں کے کنبے آباد تھے۔ تمہاری بہوویں اس بٹوارے پر خوش نہیں تھیں۔ آئے دن پانی کا تنازعہ کھڑا رہتا۔ وہ چیخ چیخ کرتیں۔ آخر میں تمہیں کو برا کہتیں اور اپنے مردوں کے کان بھرتیں۔ واہ! تمہارے یہ دونوں بیٹے بڑے خدا پرست تھے۔ سجدے کر کر کے ان کے ماتھے کالے پڑ گئے تھے۔ انھیں پورا یقین تھا کہ آنے والی زندگی میں یہ سیاہی نُور بن کے چمکے گی۔ وہ اکثر بزور کہتے۔۔۔۔ ہماری اماں نے جو کیا اُس کی معافی مانگنا اولاد کا فرض ہے۔۔۔۔ خدا اُن کی لغزشوں سے درگزر کرے۔ ہم تو چاہتے ہیں اللہ ہمیں ہمیشہ سیدھی راہ پر رکھے۔ بھٹکائے نہیں، جیسے ہماری اماں بھٹکی۔۔۔۔ توبہ۔۔۔۔ توبہ۔۔۔۔ ہمیں تو لوگوں کے درمیان رہنے جوگا نہیں چھوڑا۔۔۔۔ اللہ رسول ان کی منزلیں آسان کرے۔

تمہارے دو چھوٹے بیٹے بھی الگ الگ مکانوں میں رہتے تھے۔ یہ دونوں بھی سرکاری محکموں میں چھوٹے موٹے افسر تھے۔ ان میں سے بڑے بھائی چچا فضل کی بیوی ثنا مجھے اچھی لگتی تھی۔ اُس کے لباس سے ہمیشہ خوشبو آتی تھی۔ اعلیٰ اور مہنگی پوشاک زیب تن کرنے والی چاچی ثنا قدرے خودپسند مگر مہذب تھی۔ چچا فضل خود بھی خوش لباس تھے۔

چچا صالح جو عمر میں سب سے چھوٹے تھے۔ نہایت کم گو، لڑکیوں کی طرح تمہارے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ جاتے، مسکراتے رہتے۔ ان کی بیوی، چچی نواب بیگم بڑی ہوشیار اور طرار تھی۔ سنا ہے وہ چچا صالح سے عمر میں بہت چھوٹی تھی۔ خصم کو مرید رکھنے کا گُر جانتی تھی۔

چاروں بیٹوں نے لمبی لمبی ڈاڑھیاں چھوڑی ہوئی تھیں۔ جب دیکھو مسجد میں آتے جاتے نظر آتے۔ تاثر کچھ یوں دیتے تھے جیسے ماں کے گناہوں کا کفارہ ادا کر رہے ہوں۔ تمہاری بہوویں اکثر سنا سنا کر' توبہ استغفار کرتے ہوئے دوسروں کو یہ احساس دلاتی رہتی تھیں۔ کسی کا منہ بند تو نہیں کیا جا سکتا۔ نہ لوگوں کی زبان پکڑی جا سکتی ہے۔ وہ جو لوگوں کو باور کرانا چاہتی تھیں' وہ ہو چکا تھا۔ زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو۔۔۔۔ نقارہ بج چکا تھا۔۔۔۔ ماں کے کرتوتوں کا کفارہ اولاد ہی کو ادا کرنا پڑتا ہے۔۔۔۔ تو زہرہ دادی! تمہارے کرتوت لوگوں کی زبان پر ہیں اور ہم بچوں کو کچھ پتا بھی نہیں۔ کوئی ہمارے ذہنوں کے جالوں کو تو صاف کرے اور یہ لوگ کون ہیں؟۔۔۔۔ جو سب کا حساب کتاب کرتے ہیں۔ جمع تفریق میں لگے رہتے ہیں۔۔۔۔ کیا یہ اللہ میاں ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے یہی اللہ میاں ہیں جو ہر وقت آنکھیں کھلی رکھتے ہیں۔ غلطیاں پکڑتے ہیں اور منہ پر مارتے ہیں جھگو جھگو کر۔ دادی ماں! تم نے ہمارے لیے اچھا ورثہ نہیں چھوڑا۔ دور نزدیک کے سبھی رشتہ دار شرمندہ ہیں۔ حتیٰ کہ بچے بھی اور ہم جو سگے پوتے نہیں' اس عذاب میں مبتلا ہیں۔۔۔۔ رشتہ داری جو ہوئی۔ کوئی سمجھے تو سب کچھ ایک روایت ہے۔ لوگ کہتے ہیں' تم جنتن بنتے بنتے رہ گئیں۔ تم بدنصیب ہو' ہاتھ میں آئی سعادت کھو دی' چھوڑ دی اپنے ہاتھوں سے۔

زہرہ دادی! یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ آدمی روایت کو رَدّ کر دے' دانستہ۔ میرا تو خیال ہے تمہیں روایت کی تقلید کا سلیقہ نہ تھا۔ جبھی تو تم اپنی بہوؤں سے ساس کی طرح ٹکرائی نہیں تھیں۔ اُن کو اُن کے حال پر چھوڑے رکھا۔ حالانکہ وہ بھی سنا کے' کبھی چھپا کے اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑتی تھیں ٹکراؤ کی اور تم تھیں کہ نظرانداز کر کے رکھ دیتی تھیں جیسے کچھ ہُوا ہی نہیں۔ اور نہ سہی' محض رواجی طور پر لعنت پھٹکار کرنے میں کیا حرج ہے۔ رواجی طور پر ہی سہی۔ اچھی لگتی ہے ہماہمی۔۔۔۔ دیکھا جائے تو یہ دنیا' یہ شب و روز ایک ہماہمی کا ہنگامہ ہی تو ہے۔ رونق ہے ہمارے دَم سے۔ ہم لوگوں کے دَم سے جتنے جھگڑے ہیں وہی تو ایک دوسرے کی پہچان ہیں۔ انفرادیت بناتے ہیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے ایک سو برس تک کیسے جی لیا۔ پوری ایک صدی۔۔۔۔ اپنے بچوں کے درمیان' اُن کی اولادوں کے مابین۔ دنیا والوں کے بیچ جیتی رہیں اور جیتی ہی چلی گئیں۔ بغیر لڑے جھگڑے۔ تم جیسے بندے کو World Peace Award ملنا چاہیے تھا۔ مگر تم جیسے لوگوں کا امن ایوارڈ دینے والی کمیٹی کو پتا ہی نہیں چلتا! اور یہ کونسا کام ہے کہ بس چُپ چاپ اپنی موج میں من مرضی سے جیتے رہو۔۔۔۔ جتنی اوپر والے نے دی ہے بھوگو ضرور۔

سنا ہے دادی ماں! جہاں تمہارے بزرگوں نے تمہاری شادی کی' تم وہاں سے سہاگ رات ہی کو بھاگ آئیں۔ پیدل ہی دوڑ آئیں۔ حالانکہ تمہارے میکے گاؤں اور سسرالی گاؤں میں دس میل کا فاصلہ تھا۔ تم نے علی الصبح جب میاں جی مسجد میں لوگوں کو نماز کے لیے بلا رہے تھے' دائیں بائیں اعلان ہو رہا تھا۔۔۔۔ نماز' نیند سے بہتر ہے۔۔۔۔ نماز' نیند سے بہتر ہے۔۔۔۔ تو تم دس میل کا سفر طے کر کے بھی تازہ دم تھیں' چوکس تھیں اور ماں باپ کے دَر پر دستک دے رہی تھیں۔

تمہارے دہشت زدہ باپ نے لالٹین کی روشنی میں کنڈی کھولی۔ سامنے تم کھڑی تھیں۔ خلافِ توقع تم ہی کھڑی تھیں۔ کاتک کی شبنمی رات نے تمہارے عروسی لال جُوڑے کو بھگو دیا تھا۔۔۔۔ ستم زدہ اور لُٹی ہوئی۔ تمہارے جسم پر کوئی زیور نہ تھا۔۔۔۔

"صاحباں!۔۔۔۔ تم۔۔۔۔ وہیے۔۔۔۔؟"

باپ کے منہ سے وہیے کا لفظ سنتے ہی تم ایک دلخراش چیخ کے ساتھ باپ کے سینے سے جا ٹکرائی تھیں۔ لالٹین کی لو اُچھلی۔ مٹی کا تیل بھی چھلکا۔ وہ تو شکر ا ہُوا کہ تمہارے لال جوڑے میں آگ نہ لگی اور تم جلنے سے بچ گئیں۔ اُور جب ماں تمہاری کمر پر دوہتڑ مار کر چلائی تو تمہاری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تمہارے ابا نے تمہاری ماں کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اُسے چیخنے سے منع کر دیا تو تم نے ان دونوں کا سہارا لے کر میکے کی دہلیز پار کر لی۔ عام رواج ہے کہ رخصتی کے وقت سب والدین روایتی انداز میں بیٹی کو ہدایت کرتے

ہیں۔۔۔۔ ماں باپ کے گھر سے ڈولی میں جا رہی ہو' یاد رہے سسرالی گھر سے جنازہ نکلے تمہارا۔۔۔۔ مگر تم نے روایت کو توڑ کے رکھ دیا۔ ماں باپ نے بھی بوقتِ رخصت کہی ہوئی بات کو رسمی سمجھا اور روایتی جانا اور تمہارے ڈھیلے بدن کو سہارا دیتے ہوئے دالان میں لے گئے۔ کیا کرتے؟ مجبور تھے فطرت سے۔ فطرت جو منہ زور ہے' بھٹکتی ہے۔ باتوں سے نہیں مانتی۔ کبھی کبھی تو لاتوں کی بھی پروا نہیں کرتی۔ یہ بڑوں بڑوں کو دھنک کے رکھ دیتی ہے۔

پھر ماں کے بے حد اصرار پر تم نے سسک سسک کر بتایا :

"ماں! وہ مرد جو تُو نے میرا مالک بنا دیا تھا' وہ میرے بخیے اُدھیڑنا چاہتا تھا۔ ابھی اُس نے میرے زیور اُتارے تھے۔ میں بھاگ آئی۔ ننگے پاؤں بھاگ آئی۔ اُس نے دُور تک میرا پیچھا کیا۔۔۔۔ اندھیرے میں' میں نے اُسے کہتے سنا۔۔۔۔ صاحباں! تیرا میرے ساتھ نکاح ہو چکا ہے اور میں تیرا مالک ہوں۔۔۔۔ مالک۔۔۔۔ ماں! نکاح کا مطلب اگر بیٹی کا کسی کے حوالے کرنا ہوتا ہے کہ وہ مالک ہو جائے تو ماں! میں بھاگ آئی ہوں۔ میں کوئی شے تو نہیں ہوں۔ مجھے اُس کا بھوکوں کی طرح اپنی طرف بڑھنا اچھا نہیں لگا۔ شادی کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ میں کوئی کھانے کی چیز ہوں کہ کوئی ندیدہ مجھ پر ٹوٹ پڑے۔

دادی ماں! سنا ہے تمہاری ماں نے تمہاری ڈنڈے سے بہت مرمت کی اور مسلسل باور کراتی رہی۔ آ میں تمہیں شادی کا مطلب سمجھاؤں۔۔۔۔ آ میں تمہیں شادی کا مطلب سمجھاؤں۔۔۔۔ پھر یہ بھی سننے میں آیا کہ کچھ عرصے بعد تم نے کر بھی لی شادی۔ مگر اپنی پسند کے آدمی سے۔ اُس میں سے تمہارے یہاں بچے ہوئے جو سب اپنے اپنے گھروں میں آباد ہیں' خوش ہیں۔ اُنھیں تم سے کوئی شکایت نہیں' ایک کے سوا۔۔۔۔ اور یہ کوئی عام شکایت نہیں۔ انسان کیا کرے۔۔۔۔ معاشرے میں رہتے ہوئے شکوے شکایت تو ہوتے ہی رہتے ہیں مگر شکایتوں سے بچنے کے لیے تم نے مذہب کا سہارا خوب لیا۔ یہ ایک اچھی بات ہوئی۔ کم از کم دنیا نے تو یہ مان لیا کہ تم اللہ سے اپنے گناہِ عظیم کی معافی تو مانگ رہی ہو۔ دیکھا جائے تو یہ ایک بہت ہی گھمبیر گناہ تھا جسے تم نے شاید جذباتی ہو کر سرزد کر

لیا۔ کسی ایک مرد کو رد کر دیا۔۔۔۔ ایک مرد جس کو تمہارے بڑوں نے۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے ماں باپ اور دیگر بزرگوں نے تمہارے لیے جائز مقرر کیا تھا۔ دعائیں اور کلام پڑھ کر کہا تھا۔۔۔۔ اب یہ رشتہ پاک ہے۔۔۔۔ پاک ہیں تمہارے تعلقات اور تم ایک دوسرے کا لباس ہو۔۔۔۔ اور کہا کہ عورتو! مرد کو سجدہ کرنا روا رکھا جاتا تمہارے لیے۔۔۔۔۔ مگر خدا ہی سجدے کا حق دار ہے۔ آخرکار تمام انسانوں کو اسی کی بندگی لازم ہے۔ جو سچا مالک ہے اور خالق ہے۔۔۔۔ تمہارے منکوح نے تم سے مالکانہ حقوق مانگے۔ شاید تم پر چڑھ دوڑا۔ تم بھاگ آئیں۔ حجلۂ عروسی سے نکلنے میں کامیاب ہو گئیں۔

نہ نہ دادی زہرہ! بڑی بات' تم کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ تم صدیوں پرانے سلسلے سے بغاوت کرو۔ ایک نئی بنائی عمارت کی دیوار کو اس زور سے پھلانگو کہ دیوار کے ڈھے جانے کے خطرات پیدا ہو جائیں۔ پرانی نسلوں نے جو کلام' منتر پڑھ پڑھ کر اینٹیں چنیں' بھلے وہ پرانی ہو چکیں' چیا بن چکیں۔ مگر تم کو یہ زیب نہیں دیتا کہ دیوار کی اینٹ سے اینٹ بجاتی پھرو۔۔۔۔ وہ تو دیوارِ گریہ ہے عورت کے لیے۔

دادی اماں! چلو تم نے یہ ہمت کر لی۔ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی جو تھیں۔ برداشت ہو گئیں۔ جہاں ایک نہیں' کئی کئی بیٹیاں ہیں وہ کیا کریں؟ ہر جان کو روزی روٹی کا مسئلہ ہے۔ چادر چار دیواری کا مسئلہ ہے۔ زندگی گزارنا ٹھیک ٹھاک مسئلہ ہے۔ دادی ماں! عورت ہونا اپنی جگہ ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے' یہ الگ مسئلہ ہے۔ عام طور پر محافظ کو مالک کے معنی کے طور پر لیا جاتا ہے۔ اس کے اختیارات کا اندازہ بیٹی کے بوجھ تلے دبے والدین نہیں کر سکتے۔ وہ دو بولوں کے منتر سے اپنا بوجھ ہلکا کر لیتے ہیں۔ اب نیا محافظ' مالک بن کر بیٹی کو کھدیڑے یا اُدھیڑ کر رکھ دے۔ چاہے تو غیرت کے نام پر قتل کر دے۔ تم نے شاید اس پر غور نہیں کیا اور اپنی مرضی کر لی۔ ہر عورت اپنی مرضی جیسی عیاشی کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اُس پر جو حفاظتی تنبو خاص حیلوں حوالوں سے تان دیا گیا ہے اُس کی طنابیں ہزاروں صدیوں کی محنت اور سوچ بچار کے بعد بنائی گئی ہیں۔

تمہیں وحشت ہوئی کہ تمہارے مالک نے تمہارے ساتھ وحشت گردوں والا رویہ برتا

اور تم لاڈ پیار اور پچکار میں پلی ہوئی الڑ تھیں۔ اکلوتی جو تھیں۔ تبھی تو ماں باپ بھی درگزر کر گئے۔ اُن کے ذمے کھلانے کے لیے صرف ایک منہ تھا۔ تمہاری وجہ سے وہ خود کو دُنیا سے' معاشرے سے جُڑا ہوا پاتے تھے سو تم اُن کی ضرورت تھیں۔ وہ جو کہتے ہیں نا! ضرورت ایجاد کی ماں ہے' سچ ہی کہتے ہیں۔ جب تم نے ایک خاص بندے کو اپنے جیون ساتھی کے طور پر چنا تو تمہارے ماں باپ جو یقیناً آج سے ڈیڑھ دو سو سال پہلے اس دنیا میں رہے ہوں گے' جو یقیناً میرے بھی بزرگ بنتے ہیں' مجھ پر ان کا احترام لازم ہے' اُنھوں نے رسموں' روایتوں کی پروا نہ کی اور تمہاری ہاں میں ہاں ملا دی۔ پھر سب بخیرو خوبی ہو گیا۔ نہ آسمان ٹوٹا' نہ زمین پھٹی۔ تم دودھوں نہائیں اور پوتوں پھلیں' پھولیں۔ مجھے یقین ہے تمہارے ماں باپ' اللہ بخشے ہمارے پردادی پردادا اس دُنیا سے خوش و خرم رخصت ہوئے ہوں گے۔

یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ تمہارا شوہر بھی تم سے خوش تھا۔ کماتا دھماتا تھا مگر تم پر دھونس نہیں جماتا تھا کہ میں تمہارا مالک ہوں جیسے چاہوں تمہیں برتوں۔

اصل میں زہرہ دادی! انسان کے اوقاتِ زندگی تاریخ در تاریخ اُس کے معاشی حالات سے جُڑے ہوئے ہیں۔ صبح و شام کے ڈانڈے معیشت پر اٹکے' جینے کی تمنا سے بندھے ہوئے ہیں۔ اس طرح زندگی رواں ہے۔ زمین اور مٹی کا سلسلہ چل رہا ہے۔۔۔۔ البتہ بیچ بیچ میں کبھی کوئی ماورا سا لمحہ آ جاتا ہے جب انسان کے پیر زمین سے ذرا اوپر اُٹھ جاتے ہیں۔ اُس لمحے میں۔۔۔۔ صرف اُس لمحے میں انسان خود کو اپنی زندگی کا مشکل اور آخری فیصلہ کرنے پر قادر پاتا ہے۔ یہ لمحہ بھی اٹل ہوتا ہے اور فیصلہ بھی اٹل ہوتا ہے۔

مگر زہرہ دادی! ایسے لمحے سب پر نہیں آتے۔ نصیب والے ہوتے ہیں وہ لوگ جو اُس لمحے کو برداشت کرتے ہیں اور پھر شانت بھی ہو جاتے ہیں۔ زمانہ اُن کی ٹھوکر پر آ جاتا ہے اس کے بعد۔۔۔۔ محبت انھیں لمحوں میں سے ایک ہے شاید اور شاید بغاوت بھی۔ ہم ان لمحات کو Spiritual Experience بھی کہہ سکتے ہیں۔ جو بلا وجہ بے قرار رکھتا ہے۔ چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ موسیٰ کو قوم عطا کرتا ہے۔ ذمہ دار اور بھاری بوجھ اٹھانے

کے قابل بنا دیتا ہے۔ مثبت + مثبت + مثبت۔

دنیا میں دو انتہائیں ہی تو ہیں' مثبت اور منفی۔ بایاں اور دایاں۔ درمیان میں رہنے والے انتہاؤں سے بچ بچ کر زندگی کے دن پورے کرتے ہیں۔ آنے والے وقت کی ٹوہ میں رہتے ہیں۔ سنی سنائی پر یقین کرتے ہیں۔ تجربے سے گریز کرتے ہیں تا عمر۔

پھر دادی ماں ـــــ پھر کیا ہُوا ـــــ مذہب پرست تو تم ہو گئیں۔ زندگی' دُعاؤں نمازوں میں مزے سے گزر رہی تھی۔ میاں گزر گیا۔ معاشی حالات تمہارے کنٹرول میں۔ عین شریعت کے مطابق۔ تمہارے حساب سے شب و روز ٹھیک جا رہے تھے۔ تمہارے پاس اتنی جمع پونجی تھی کہ تم بیٹوں کو عید بقرعید پر عیدیاں دے دیتی تھیں۔ بیٹے اپنی گزر اوقات جیسے تیسے کر لیتے تھے۔ ان چاروں کے جتھے تو تم نے شوہر کی زندگی ہی میں شریعت کے مطابق دے دیے تھے۔ وہ ماشاء اللہ اپنی بیگمات کے ساتھ والدین کے ورثہ میں سے ملے مکانوں میں رہتے تھے۔ تم نے اللہ کے حکم کی تکمیل کی تھی۔ اب تم فارغ تھیں' کرنے کو کچھ نہ تھا۔ مگر تمہارا ایمان ابھی تک مکمل نہیں ہُوا تھا۔ ارکانِ ایمان پورے کرنے کی تمنا اور کوشش ہر سمجھدار ایمان والے میں موجود رہتی ہے اور رہنی بھی چاہیے۔ تکمیل کی خواہش ایک کھرا جذبہ ہے' جینے کی مجبوری سے جُڑا ہُوا ہے۔ جینے کے لیے شعورمند کے سامنے کوئی نہ کوئی پروگرام ہوتا ہے' منفی یا مثبت۔ مثبت ہو تو قیل و قال' لیت و لعل نہیں ہوتی۔ اس میں ارادے اور دانستگی کا بڑا اہم کردار ہے۔

پتا چلا کہ تمہارے پوتے پوتیوں کی ہر شادی پر تمہاری بہوویں تم سے رقم کی توقع رکھا کرتی تھیں۔ مگر تم نے سب کو ایک ہی جواب دیا ـــــ مجھے اللہ کا گھر دیکھنے جانا ہے بس ـــــ اور کچھ نہیں ہے میرے پاس ـــــ اس جواب پر ہر بہو سے تُو تکار بھی ہوتی رہتی تھی۔ وہ تو گاہے گاہے یہ بھی کہہ دیتی تھیں :

"حج کیا؟ مائی کا نیر سپاٹا کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

اور تم شوق کے عالم میں دن رات اللہ سے زاری کرتی تھیں :

"میرے مولا بُلا لو مدینے مجھے
یہ ہجر تو دے گا نہ جینے مجھے"

پھر خدا خدا کر کے وہ دن آ ہی گیا۔ کسی باہمت خدا پرست نے تمہارے شہر میں ایک قافلہ ترتیب دیا اور منادی کرا دی۔ جو جو خدا کا گھر دیکھنے کا شوق رکھتا ہو فلاں فلاں جگہ پر فلاں فلاں شخص کے پاس اپنا نام درج کروا دے اور اپنا اپنا زادِ سفر باندھ لے۔ فلاں دن کوچ کرنا لازم ہے۔ یہاں سے سفر بیلیوں پر، سمندری جہاز پر اور آگے اونٹوں پر کرنا ہو گا۔۔۔۔ اب تو ٹیکنالوجی اتنی ترقی کر چکی ہے کہ لوگ آئے دن سمندروں، صحراؤں اور ہواؤں کا سفر کرتے ہیں۔ تمہارے وقتوں میں ایسا نہیں تھا۔ کئی کئی مہینے لگتے تھے حج پر جانے کے۔ پر جانے والے جاتے تھے۔ راستے کی صعوبتیں جھیل کر بھی پہنچ جاتے تھے۔ شوق کی راہ میں کوئی چیز بھی حائل نہیں ہوتی اور جب شوق، عشق کی حد میں داخل ہو جائے تو پھر کیا کہنا۔ کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ قافلہ سالار کو جو جو ادائیگیاں کرنا تھیں، جنہیں آج کے فیشن میں ہم حج پیکج کہنے لگے ہیں، تم از خود بیٹے کے ساتھ جا کر کر آئیں۔ حالانکہ تمہاری بہوؤں نے اس پر بھی بات بنائی۔

"اعتبار تھوڑی ہے بڑھیا کو کسی پر، حتیٰ کہ بیٹے پر بھی نہیں۔"

"چلو اماں میں چلتا ہوں ساتھ محرم کے طور پر۔۔۔۔" بیٹے نے پیشکش کی۔

"مگر خرچا کون دے گا؟" تم نے پوچھا تھا۔

بہوؤں کو تو خدا موقع دے، ایک دم اُچھلیں :

"اے اماں تم خرچہ دو گی اور کون دے گا۔"

"میرے پاس اتنے ہی پیسے تھے جو دے دیے۔"

"حج کا ثواب آپ کی نذر کر دوں گا اماں۔" چچا صالح نے ولار سے کہا۔

"مگر میں نے اپنے پاس اتنا ہی رکھا جتنا مجھے چاہیے تھا۔ باقی ٹھکانے لگا دیا۔"

چچا صالح ٹھنڈا ہو کر بیٹھ رہا اور معلم نے جو تمہارے قافلے کا سالار تھا، تمہارے محرم کی جگہ اپنا نام لکھ دیا۔ قصّہ ختم ہوا۔ بڑھاپے میں ایسی باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔

تیاری شروع ہو گئی۔ ذہنی، جسمانی اور روحانی بھی۔ اب تو صرف تمہارا کام باقی تھا۔ ؟

حیات تم اپنا کام خود کرتی رہی ہو۔ کچھ مشکل نہیں۔ دماغ کے ساتھ' دل کے ساتھ اور شاید رُوح کے ساتھ بھی کپڑوں کے تین چار نئے جوڑے بنائے گئے جو تمہارے بیٹوں نے شوق سے سلوا کر دیے۔ احرام' مصلے' تسبیح' لوٹا۔ وہ سب لوازمات جو اس نیک مقصد کے لیے ضروری تھے' ہاں۔۔۔۔ عطر' چپلیں بھی۔۔۔۔ حج کی نیت کے غسل سے پہلے تم ہاتھ پاؤں اور بالوں میں مہندی رچانا نہیں بھولیں۔ مہندی کی مہک اور سُرخی تمہیں زندگی کے آخری لمحے تک لبھاتی ہی رہی۔ نہ جانے تم لال رنگ کو اتنا کیوں پسند کرتی تھیں؟ تمہارے تو فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو گی کہ صدی ڈیڑھ صدی بعد یہ رنگ دہریوں کا رنگ قرار پائے گا اور آنے والے دور میں دنیاداروں اور دین داروں میں انتہائی تفرقہ اور پہچان قائم کرے گا۔ لال رنگ جاری سسٹم سے منحرف ہونے والوں کا نشان۔ خون خرابے کی دلیل۔ مرنے مارنے کی دھمکی کا گواہ۔۔۔۔ زہرہ دادی! تمہارے لچھن شروع دن ہی سے باغیانہ اور انقلابی تھے۔ مان ہی لو' بہت نہ سہی' تھوڑے تھوڑے تو تھے ہی۔

جس دن قافلے کے کُوچ کرنے کا دن تھا' تمہاری برادری نے تمہیں ہاروں' پھولوں سے لاد دیا اور خوب ڈھول ڈھمکا ہُوا۔ تمہاری سواری کے آگے جوانوں نے بھنگڑے جھومر ڈالے' پٹاخے چھوڑے' جیسے تمہارا بیاہ ہو رہا ہو۔ رخصتی کے وقت بڑے بوڑھوں نے تمہارے ہاتھ چُومے اور رقت آمیز لہجے میں کہتے رہے۔

"ہمارا سلام لیتی جاؤ۔۔۔۔ ہمارا ایک پیغام لیتی جاؤ۔ نبیوں کے سردار ؐ سے کہنا۔۔۔۔ آخرت کے روز ہمیں نہ بھلائے۔ ہم اُن ؐ کے گنہگار اُمتی ہیں۔۔۔۔۔"

"ارے میں تو پہلے اللہ کے گھر جاؤں گی اللہ کے بندو! اور رسولؐ نے کہاں کہا کہ میں تمہیں بخشواؤں گا۔ وہ تو اپنی لاڈلی بیٹی کو بھی کہتے تھے "فاطمہ ؓ عمل کر۔۔۔۔ عمل کر فاطمہ ؓ""

دادی ماں! لوگ تو ایسے ہی ہیں۔ بے عمل اور جذباتی۔ خیالوں میں بہت دُور نکل جاتے ہیں۔۔۔۔ مزے لیتے ہیں۔

دادی ماں! سفر تو جیسے تیسے گزر گیا۔ یہ آگے چل کر عین حرم کے سامنے پہنچ کر تم اپنی

باغی طبیعت کو دبا نہ سکیں۔ ایسی ہی کوئی گھڑی ہوتی ہے جب شیطان اپنا کام کر جاتا ہے۔
تمہیں خیال نہ رہا تم کہاں کھڑی ہو؟ کیا کہہ رہی ہو۔۔۔۔۔؟ سچ کہا سیانوں نے کہ بندے! شیطان ہر وقت تیرے تعاقب میں ہے۔ اللہ کا بندہ تو کانوں کو ہاتھ لگا کر معافی مانگ لیتا ہے مگر شیطان کے بندے کو معافی مانگنے کا خیال نہیں آتا۔ آگے سے ہٹ کرنے لگتا ہے۔ دلائل دیتا ہے' دلائل مانگتا ہے۔ گناہوں کے گٹھڑ بنتے چلے جاتے ہیں' جو عام آدمی کو بھی نظر آ جاتے ہیں' بلکہ دُور سے نظر آ جاتے ہیں اور وہ پریشان ہو جاتا ہے۔
اُس کے پاس استغفراللہ کے سوا کہنے کو کچھ نہیں ہوتا۔
تمہیں اور تمہارے اعمال پر کئی نسلیں استغفار بھیج چکیں۔ تمہاری معافی کا کوئی جواز ابھی تک کسی کے سامنے نہیں آیا۔ کسی کو معلوم نہیں کہ تمہیں اور تمہاری غلطی کو کیوں کر درگزر کی منزل تک پہنچایا جائے۔
تمہیں پتا تو تھا زہرہ دادی کہ زمین پر سارے کام پیسے سے چلتے ہیں خواہ وہ کام دنیوی ہوں یا روحانی۔ تم نے خود ساری زندگی اس مقولے پر عمل کیا۔۔۔۔
"جیسا پیسہ گانٹھ کا ویسا میت نہ کو۔۔۔۔"
حرم تک پہنچ کر تم نے بیچ بیچ جیب جھاڑ دی اور کہا :
"مجھے اللہ کے گھر خالی جانا ہے۔ مجھے جانے دو۔ وہ کرم کرے گا۔"
سنا ہے اُس وقت' یعنی تمہارے وقت میں حرم شریف میں داخل ہونے کی کچھ فیس بھی لگتی تھی۔ تمہارے قافلہ سالار نے' جو کاغذات کے حوالے سے تمہارا محرم بھی تھا' فیس جمع کرانے کا حکم دیا۔ تم اکڑ گئیں' بلکہ غصے سے بپھر گئیں اور برملا کہا :
"میری جیب خالی ہے۔ کچھ نہیں ہے میرے پاس دینے کو۔ سب کچھ خرچ کر چکی۔ خالی ہاتھ ہوں۔ اس در پر بھی پیسہ چاہیے۔ اب کیا کروں۔۔۔۔؟"
قافلے والوں میں سے کچھ نے رائے دی :
"گھبراؤ نہیں اماں! ہم بھرتے ہیں تمہاری فیس۔ دیکھتے ہیں تمہیں حرم میں داخل ہونے سے کون روکتا ہے۔"

سنا ہے تم جہاں کھڑی تھیں وہیں کھڑی رہیں---- لوگ کلام اللہ کا ورد کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اور تم اپنی بولی میں بڑبڑائے جاتی تھیں۔

"ارے اللہ کا گھر دیکھنے کے پیسے دینے پڑتے ہیں---- کیوں؟ آخر کیوں؟ یہ تو سب کے لیے کھلا ہونا چاہیے۔ ہر وقت کھلا رہنا چاہیے۔ کہتے ہیں اللہ کے بندوں کے لیے توبہ کے دروازے کبھی بند نہیں ہوتے۔ اللہ کا دَر بند نہیں ہوتا۔"

زہرہ دادی! تم اُس وقت دیوانی ہو گئی تھیں اور یہ بھول گئی تھیں کہ کاروبارِ حیات میں یہ سب چلتا ہے۔ خدا کو حیات سے الگ تو نہیں کیا جا سکتا۔ تم پھر ضد میں 'بنا حج کیے' لوٹ آئیں۔ اوفو! یہ تو ایک شاعر نے کہا تھا:

مصرع لوٹ آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہُوا

یہ بتاؤ؟ اس شاعر تک تمہاری گستاخی کی داستان کیوں کر پہنچی اور بتاؤ وہ شاعر تمہارا ہم عصر تھا؟ مگر تم کیوں کر بتا پاؤ گی؟ کہاں تم اور کہاں اتنا بڑا شاعر! تم کوئی معروف ہستی نہ تھیں جو وہ تمہارا نوٹس لیتا---- مگر بدنامی کے پر نیک نامی سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔ میڈیا کی بھی ضرورت نہیں۔ بدنامی' جنگل کی آگ ہوتی ہے۔ پھیلتی ہے اور دیکھتے دیکھتے پھیلتی چلی جاتی ہے۔ کوئی کیا کر سکتا ہے۔ بدنامی سے ڈرنے والے محتاط رویہ اختیار کرتے ہیں۔ کوشش کرتے ہیں بُری بات باہر نہ نکلے' نکلے بھی تو خوش خبری بن کر۔

دادی ماں! دُعا ہی کی جا سکتی ہے تمہارے حق میں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے کیا' سب کے دلوں کو تمہاری طرف سے صاف کرے اور عذاب سے بچائے۔ میں تم پر جانے کیوں اتنی فریفتہ ہُوں----؟ اللہ تعالیٰ ہم دونوں کو معاف کرے۔ آمین

(یکم ستمبر2004ء)

OOOOO

شاد کام

میں تن تنہا کھڑا ہوں۔ اردگرد پھیلا ہوا' مستقبل میں بننے والی ایک رہائشی سکیم کا ناہموار' بے ہنگم رقبہ اور پانی کی زیرِ تعمیر ٹینکی جو مجھ سے کم از کم دو کلومیٹر کے فاصلے سے دھندلی سی نظر آتی تھی۔ پھر میری پھیکی سی چھایا نے ایک جوشیلے مگر گرمی سے بے حال' پیاس سے نڈھال شخص کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ دھوپ جو چلچلا رہی تھی اور چٹیل زمین گرمی کی شدت سے کپکپاتی ہوئی لگ رہی تھی۔

اُس شخص نے چھایا میں آتے ہی ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی۔ قمیص کا گریبان کھول کر رومال سے ہوا کرنے لگا۔ مجھے وہ بے بس مگر اچھا لگا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اُس شخص نے مجھ پر اعتبار کیا اور میری ضرورت محسوس کی۔ میں اپنی نظر میں معتبر ہو گیا۔۔۔۔۔ ذات کے اعتبار کے لیے گواہی ملنا بہت ضروری ہے۔ کم از کم میری زندگی کا تجربہ تو یہی ہے۔

پھر اُس شخص نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔۔۔۔ "لو بھئی۔۔۔۔ طارق صاحب! جُت جاؤ اپنے کام میں۔ اللہ میاں نے تمہارے لیے سائے کا بندوبست کر دیا۔ بے شک وہ رحیم ہے' وہ کریم ہے۔"

پھر اُس نے پیار بھری نظر سے میرے وجود کا جائزہ لیا۔ میں اُس کے پیار کی بوچھاڑ میں بھیگ سا گیا۔ پیار کی بھرپور نظر کا تجربہ مجھے اس سے پہلے نہ تھا کہ یکدم قربان ہو جانے کو جی تڑپ اُٹھے۔۔۔۔ پھر وہ شخص میرے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اگرچہ اس دوران

چڑیوں کا وہ جوڑا جو کچھ دنوں سے مجھ میں چھپ کر دوپہر بسر کیا کرتا تھا' آہٹ پا کر اُڑ گیا۔ مجھے اُن کا اُڑ جانا اچھا نہیں لگا۔ چڑیوں کے اِس جوڑے کو مجھ پر اعتماد تھا۔ وہ بیٹھ کر آپس میں بلا تکلف پیار اور دُکھ سُکھ کی باتیں کیا کرتے تھے۔ اُن کی گفتگو سے مجھے دور و نزدیک کی بہت سی باتوں کا پتا چلا۔ جیسے آج مجھے اس شخص کے نام کا پتا چلا----
"طارق"----

طارق استراحت سے ٹیک لگائے کھڑا ہے۔ اِدھر اُدھر نظریں گھما کر جائزہ لے رہا ہے۔ نہایت استغراق کے ساتھ' اپنے ارادوں میں گم' میرے تنے کے ساتھ اٹکا ہُوا' اُس کے پسینے کی مشقت بھری نمی میرے وجود کو نم کر رہی ہے۔ اس چلچلاتی دوپہر میں مجھے اُس کے وجود کی باس والی نمی سیراب کر رہی ہے۔ مجھے اچھا لگ رہا ہے---- اچھا لگنا بھی خوب تجربہ ہے' بڑا یقینی اور تن من میں رچتا ہُوا' ذات کا حصّہ بنتا ہُوا---- میں نے اپنے رب سے اپنی چوٹی سے جڑوں تک' پورے وجود کے ساتھ دُعا کی ہے---- اے رب کرم کر---- طارق کو یہاں سے میرے سائے میں رہنے کی توفیق عطا کر---- اُسے اپنی مہربانی سے ہمت عطا کر کہ وہ اس ویرانے کو رونق بھری زینت دے۔ جیسی کہ تُو نے مجھے عطا کی۔ بے شک سب کچھ تیرے اختیار میں ہے۔ میں تو محض ایک پودا ہوں۔ پورا درخت بھی نہیں۔

پھر طارق نے اپنے تھیلے میں سے کچھ کاغذات نکالے۔ پانی کی ایک بوتل نکالی۔ گھونٹ گھونٹ پانی پیتا کاغذات کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ بہت مسرور تھا۔ تھیلے میں سے سینڈوچ نکال کر رغبت سے کھاتے ہوئے طارق نے اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی زمین کو اپنی بانہیں پھیلا گھما کر ماپا اور خودکلامی سی کی :

"بنے گا---- اللہ نے چاہا تو بنے گا----"

میری نس نس اُس وقت کان بنی ہُوئی تھی۔ اُس کی ہر حرکت' ہر سانس' ہر آواز میرے وجود کو ایک نئے زمانے کا پیغام محسوس ہوئی۔ نیا پن ہر شے کی مرغوب غذا ہے۔

تمنا کا زندگی کے لیے من چاہا آدرش ہے۔۔۔۔ پھر میں طارق کے ساتھ اُس کی دُعا میں شامل ہو گیا۔

"اللہ اللہ۔۔۔۔۔! ارادوں کے ضامن۔۔۔۔ بے بسوں کی پناہ کے دامن۔۔۔۔ کرم کر' ہم پہ کرم کر۔۔۔۔ ارے۔۔۔۔ میں۔۔۔۔ "میں" سے "ہم" تک کیسے پہنچ گیا۔ یہ کیا ہو گیا؟ کیسے ہو گیا کہ میں اکیلا کھڑا کھڑا 'میں' سے 'ہم' ہو گیا۔ مجھے اپنا آپ کھلا کھلا اور پھیلتا محسوس ہو رہا ہے۔ اس شخص نے مجھے 'میں سے ہم کہنے تک کا سفر کتنی سہولت سے کروا دیا۔ مجھے تو پتا بھی نہ چلا۔ بڑا مزا آ رہا ہے۔

طارق نے اپنا سینڈوچ ختم کر کے دو گھونٹ اور بھرے۔ پھر بوتل کو غور سے دیکھا اور میری جڑوں کی طرف جھک کر دو چھپاکے پانی آنکھوں پر ڈالا۔

"اوہ میں تو نہال ہو گیا۔۔۔۔ مٹی جس میں میری جڑیں جمی ہوئی ہیں۔ خوشی سے خوشبو دینے لگی ہے۔ لگتا ہے میری ماں۔۔۔۔ مٹی۔۔۔۔ خود کو بے حد شادکام پا رہی ہے۔ تبھی تو ذرا سے چھینٹے سے مہک اُٹھی۔ مٹی ماں کبھی کبھی مہکتی ہے۔ جب جب وہ نئی ترنگ سے ہم آہنگ ہوتی ہے تب۔ میں مٹی کی اُمنگ کو جانتا ہوں' پہچانتا ہوں۔ کیونکہ میں اُس میں سے ہوں نا!

سو آج میں اور میری ماں دونوں مسرور ہیں۔ لگتا ہے میرے آس پاس کا ماحول بھی پُر مسرت ہے۔ کوئی معجزہ ہے کہ ہم اُس کی گرفت میں ہیں آج۔۔۔۔ پچ۔۔۔۔ پچ۔ ہم تینوں کو ایک تجربے نے ایک کر دیا ہے۔ اس وقت 'میں' میں نہیں۔۔۔۔ مٹی' مٹی نہیں۔۔۔۔ طارق' طارق نہیں۔ ہم ایک ہیں۔ ایک لہر ہیں۔ اوپر اور اُٹھتی ہوئی لامتناہی میں۔۔۔۔ پھیلتی ہوئی ایک دُھن ہیں۔ ایک سلسلہ ہیں نہ ہونے اور ہونے کے بیچ۔

دھوپ ڈھلنے لگی ہے۔ ہمارا سایا لمبا ہونے کو ہے مشرق کی طرف۔۔۔۔ طارق کا سایا اب مجھ میں ہے۔ مجھے زندگی' سایوں کا کھیل سا لگ رہا ہے۔

وہ اپنا تھیلا سنبھال کر اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی سٹارٹ ہوئی اور پھر یہ جا وہ جا۔ میں

اپنی جگہ کھڑا دیکھتا رہا۔

اُس کے جاتے ہی چڑیوں کا جوڑا' دن بھر کا تھکا ماندہ میری پتلی ٹہنیوں میں آکر روز کی طرح آپس میں تبادلہ خیال کرنے لگا ہے۔ میں آج ان کی گپ شپ پر زیادہ دھیان نہیں دے پا رہا۔ جانے کیوں؟ میرے وجود میں ایک نئی طرح کی سنسنی سی ہے جس کو صرف میں محسوس کر رہا ہوں۔ معصوم چڑیوں کو کیا خبر؟

کئی دن گزر گئے۔ بلکہ کئی ہفتے ہونے کو آئے میں اُس کی راہ دیکھے جا رہا ہوں----دیکھے ہی جا رہا ہوں---- راہ تکتے تکتے میری شاخیں پک سی گئی ہیں اور پتے جھڑنے لگے ہیں۔ میں روز بروز اپنے چھدراتے سائے میں طارق کے سائے کو بکھرتا دیکھنے لگا ہوں۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ خزاں کی آمد آمد ہے نا! شاید یہ اس کا اثر ہے۔ خزاں کا اپنا کرتب ہے۔ دلوں کو اُداس کر دیتی ہے تاکہ دل بہار کی ہماہمی بھلا کر سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ فنا' حقیقت ہے۔ حقیقت ہے زندگی کی طرح---- اے حقیقت! میں تیرا منتظر ہوں---- آ---- آغوش میں لے لے اور مجھ پر آشکار ہو جا۔ مجھے موجود لمحے کی کوکھ میں چھپے لمحوں سے آشنا کر دے۔ میں نے ابھی زندگی سے راہ و رسم بڑھانے کا تجربہ ہی تو کیا ہے---- اُس اجنبی شخص نے جسے میں طارق کے نام سے یاد کرتا ہوں' کہاں ہے؟ کہاں ہے وہ؟ کیسا طمطراق تھا اُس کے ارادے میں----! اور میں کیسے اُس کا ہم آواز ہو گیا اور کیسے اُس کے من میں ٹھنی ہوئی بات کو اُسی کے لہجے میں دُہرانے لگا۔ یوں لگا جیسے وہ میرے من کی بات کہہ رہا ہو یا میں اُس کے دل کی بات کہہ رہا ہوں---- اور کہے جا رہا ہوں۔ وہ مجھے 'ہم' سے ہمکنار کر کے کسی لمبی مہم پہ نکل گیا ہے۔ میں اپنی جگہ کھڑا' خود کو اکیلا نہیں پاتا---- اُس کے لہجے کی ترنگ میرے ساتھ ہے جینے کی اُمنگ کی مانند۔ اِس اُمنگ کے ہوتے ہوئے خزاں میرا کچھ نہ بگاڑ سکے گی۔ بے شک خزاں حقیقت ہے۔

چڑیوں کے اس جوڑے کی گفتگو کو اس سے پہلے میں ناقابلِ توجہ سمجھتا تھا لیکن اب

نہیں۔ اُن کی باتوں کو اب میں معنی دینے لگا ہوں اور جانتا ہوں کہ اس دنیا میں ہر بات معنی رکھتی ہے اور سمجھ میں آنے کی اہمیت رکھتی ہے۔۔۔۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر بات ہر وقت قابلِ توجہ نہیں ہوتی۔ اِک معجزنما لمحے کا انتظار دانستہ بھی نہیں ہوتا۔۔۔۔ جب وہ لمحہ آتا ہے تو آہٹ بھی نہیں ہوتی۔۔۔۔ آتا ہے تو کایا کلپ ہو جاتی ہے۔ اُس کے بعد انتظار کا موسم چھا جاتا ہے۔ جیسے آج کل مجھ پہ ہے۔ ایک ناقابلِ بیان کیفیت۔ آگہی اور ناآگہی کے بیچ کہ کچھ کہا نہ جاسکے۔

گو کہ چاروں طرف دُھند کی دبیز تہہ نے سورج کا رستہ روک رکھا ہے۔ خاموشی ایک انتہا کو چھُو کر میرے وجود سے ہم کلام ہونے کی جسارت کرتی ہے اور میں نہیں جانتا کہ یہ ناقابلِ شکست سکوت کون توڑے گا۔۔۔۔ کب توڑے گا۔۔۔۔ دُھند کا موسم' انتظار کا موسم اصل میں دونوں ایک ہیں۔۔۔۔ میں اب سمجھنے لگا ہُوں اِس کیفیت کو۔

ارے۔۔۔۔ دو نقطہ نقطہ بھر روشنی کے دائرے کہرے سے طلوع ہو کر سامنے آ گئے۔ میری طرف بڑھ رہے ہیں جیسے دُھول کو پیچھے دھکیلتے ہوئے دو نین میری اور بڑھے آتے ہیں۔ روشنی اور اس گھمبیر سناٹے میں۔۔۔۔ میں کچھ کھلبلا سا گیا ہُوں۔ میرا وجود اس کہرے اور سکوت کا حِصّہ ہے۔ جانے روشنی کی اس بوچھاڑ میں شرابور کیوں ہے؟ روشنی کی بوچھاڑ میرے قریب آتے آتے مجھے اپنے اندر سمیٹ رہی ہے۔ میں دُھند میں لپٹا' خود اُن دو روشن آنکھوں سے پھوٹتے ہوئے نُور کا تقریباً حِصّہ بن گیا ہُوں کہ یہ دو آنکھیں مجھ ہی پر مرکوز ہیں۔

"دھروؤں۔۔۔۔ دھروؤں۔۔۔۔ دھروں دھک۔۔۔۔"

ہیں۔۔۔۔! یہ کون آیا۔۔۔۔؟ میرا پَت پَت آنکھ بن گیا ہے۔ گاڑی کا اگلا دروازہ کھُلا۔۔۔۔ اوہ۔۔۔۔ او۔۔۔۔ یہ تو طارق ہے۔ میری شاخ شاخ حیرانی سے لرزنے لگی ہے۔ ایسے میں کہاں سے آگیا؟ کہرے کے دبیز لحاف کو چیرتا ہُوا۔ اُس نے پہلی نظر مجھ ہی پر ڈالی ہے۔۔۔۔ میں سرور میں کپکپا سا گیا ہُوں۔

اُس نے اپنے پیارے پیارے دو بیٹوں اور بیوی کو میری آنکھوں یعنی زرد پتوں اور شاخوں کے نیچے رُک جانے کو کہا ہے---- مجھ سے کچھ نہیں کہا ہے۔ میری موجودگی اور میری ضرورت ضرور محسوس کی ہے لیکن میں اُس کے پیاروں کو وقت کی سرد مہری سے کیونکر بچا سکتا ہوں۔ اوس کی بوندیں میرے پتوں سے آنسوؤں کی طرح ٹپک رہی ہیں۔ مجھے خطرہ ہے کہ میں تو موسم بھر اشکوں میں بھیگتا رہا ہوں' طارق کا خاندان نہ بھیگ جائے۔ بھیگنا وہ بھی آنسوؤں یا اوس میں بچوں کے لیے اچھا نہیں ہوتا' کونپلوں کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔ اس گھٹنا کا تجربہ تو مجھے پچھلے برس ہی ہو گیا تھا۔ بے شک میں اُس وقت چھوٹا تھا۔ طارق ایک چکر لگا کر واپس آ گیا۔ اُس نے اپنے بیٹوں کو بانہوں میں سمیٹ کر اپنی بیوی سے بات کی :

"سنو معصبر! یہ چھوٹا سا بُوٹا میرے لیے اُمید کا استعارہ بنا---- اب اُس پر خزاں چھا گئی ہے۔ موسم بدلنے پر ہرا بھرا ہو جائے گا۔"

"ان شاء اللہ----" یہ جواب اُس کی بیوی کا ہے۔ اس کی آواز کیسی مترنم ہے---- اُمید سے بھری رسیلی' میٹھی----"

اب ان شاء اللہ ہم عمارت مارچ کے مہینے میں شروع کر دیں گے---- اس کی پہلی اینٹ تم رکھو گی---- معصبر----!" وہ بڑی محبت سے کہہ رہا ہے "اور میں اس کالج کا نام ہی "معصبر" رکھوں گا۔ تمہارے نام پر---- معصبر----! شاہ جہاں کی طرح---- شاہجہان نے بیوی کی محبت کے ثبوت میں مقبرہ تعمیر کروایا تھا---- میں ادارہ بناؤں گا---- مجھے اس سرزمین سے بھی اتنا ہی پیار ہے جتنا تم سے معصبر----! تم میرے بچوں کی ماں ہو اور یہ دھرتی میری ماں ہے اور میں کوئی بادشاہ نہیں کہ مقبرہ تعمیر کراؤں---- عام آدمی ہوں----"

"تم نے سچ کہا طارق! عورت اور زمین میں فرق ہی کیا ہے؟" اب معصبر بولنے لگی ہے۔ جب طارق بول رہا تھا تو وہ طارق کو دیکھنے کی بجائے زمین کی طرف نظریں گاڑے

مئودب' دُور اندیش بیوی کی طرح زمین کو تکے جاتی تھی۔ اب وہ محبوب کی آنکھوں میں ارادوں کے تار و پود میں اُلجھی' مجھے بہت اچھی لگ رہی ہے۔ اعتماد کا رنگ اُس کے رخساروں تک اُچھل آیا ہے۔۔۔۔ لال۔۔۔۔ بالکل لہو جیسا۔۔۔۔ مصبر خوبصورت ہے۔۔۔۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ اُسے زندگی سے پیار ہے' جیسے مجھے ہے۔۔۔۔ بڑھنے سے' پھلنے پھولنے سے محبت ہے۔

دونوں نے تھرماس میں سے گرم گرم کافی کاغذی گلاسوں میں اُنڈیلی۔ بیٹوں کے لیے مصبر نے اپنے پرس سے بسکٹ کے ننھے ننھے دو پیکٹ نکالے۔ بیٹے جو اب تک دُھند کے بادل میں چھپن چھپائی کھیل کھیل کر انگارے بنے ہوئے تھے' باپ کی آواز پر بھاگے چلے آئے ہیں۔ بچوں کو والدین کے پلان اور گفتگو کا کچھ پتا نہیں مگر وہ خوش ہیں۔ چاروں افراد پُرجوش ہیں۔ چہک رہے ہیں بالکل میری شاخ پر بسیرا کرنے والے پرندوں کی مانند۔ وہ چہکتے چہکتے اپنی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں لال روشنی کی دو آنکھیں دور کہرے میں جھمکتی' جلتی بجھتی دیکھتا رہا۔ شاید وہ موڑ کاٹ چکے مگر میں انہیں کہرے میں تلاش کر رہا ہوں۔

لو۔۔۔۔! میری ٹہنیوں پر انکھوے پھوٹنے کو ہیں کہ میرے بدن میں اِک اُچلاہٹ سی پھیلتی جا رہی ہے۔ فضا کروٹ لے کر سنبھل رہی ہے۔ دُھند چھٹے دو مہینے گزرے' طارق نہیں آیا۔ شاید اُس کا مارچ نہیں آیا جیسا کہ اُس نے یہاں کھڑے ہوئے اپنی بانو سے کہا تھا۔۔۔۔ کہا تھا' وعدہ نہیں کیا تھا۔ وعدہ' انتظار کے لمحے بھاری کر دیتا ہے۔۔۔۔ سو اب میں ہلکا پھلکا ہوں۔

دھادم دھادم۔۔۔۔ اینٹیں اُتر رہی ہیں۔ پانی کا نل تو ابھی چار دن پہلے چند کاریگر مجھ سے کچھ فاصلے پر فٹ کر گئے تھے۔ اُنہوں نے کمال مہربانی سے مجھے نہلا بھی دیا تھا۔ اُس دن میں نے خود کو بہت تازہ دم اور توانا محسوس کیا۔ سچ کہا سیانوں نے' پانی بہت بڑی نعمت ہے۔ موسم سرما کے طویل دورانیے نے مجھے یبوست زدہ کر کے رکھ دیا تھا۔ مجھ میں زندگی

کی تھرتھراہٹ جنم لینے لگی تھی۔ مزدوروں نے مجھے نہلا کر از سرِ نو زندگی سے ہمکنار کر دیا۔ میری ٹہنیوں پر پھول تو پہا گن ہی میں کھلنے کے لیے بے قرار تھے۔ اب ہر روز کھل رہے ہیں۔ ان کی من بھاونی مہک دلوں کو لبھاتی ہے۔ ابھی ابھی گھڑ گھڑ کرتی ٹرالی پر ایک ٹرالی مزدور ریڈیو بجاتا میرے قریب پل بھر کو رُکا اور لمبی سانس کھینچ کر اپنے ساتھی سے بولا :

"یار ایہ کنی سوہنی خشبو اے۔"

"ایہ کاہدا رُکھ اے؟" اُس کے ساتھی نے پوچھا۔

"ایہ شرینہ اے۔" ٹرالی والے نے اپنے کم عمر ساتھی کو بتایا۔

اور تب مجھے اپنے نام کا پتا چلا کہ میں شرینہ ہوں اور میری ایک پہچان ہے۔۔۔۔ خوشبو۔۔۔۔ خوشبو دیکھے بنا بھی پہچان کروا دیتی ہے۔ لیکن طارق نے مجھے کوئی نام نہیں دیا۔۔۔۔ اور یہ چڑیاں۔۔۔۔ یہ فاختائیں؟ جیسے انہیں کچھ بھی نہیں آتا۔۔۔۔ ہُو ہُو' چہ چہ کے سوا۔ یہ مزدور زمین سے جُڑے ہوئے لوگ ہیں نا۔ انہیں زمینی چیزوں کا پتا ہے۔ میں بھی زمین سے جُڑا ہُوا ہوں۔ اس لیے وہ میری خوشبو کو پہچانتے ہیں۔ ہم ایک ہی زمین کے جائے جو ہیں۔

ارے واہ! آج یہاں میرے آس پاس بڑی رونق اور گہماگہمی ہے۔۔۔۔ طارق اپنی فیملی سمیت آیا ہے۔ اُس کی گاڑی کے پاس دو ایک گاڑیاں اور بھی کھڑی ہیں۔ نہ معلوم یہ لوگ کون ہیں؟ جو بھی ہیں۔۔۔۔ کام شروع ہونے والا ہے۔ طارق کے پلان کے مطابق یہ لوگ نقشہ لیے کھڑے ہیں شاید۔ بانو اور بچے گاڑی میں بیٹھے اِرد گرد کا نظارا کر رہے ہیں۔ سائٹ پر مزدور پھاوڑے چلانے میں اتنے مصروف ہیں جیسے پھاوڑا چلانے کے سوا دُنیا میں اور کوئی کام ہی نہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے زمین کا کافی حصّہ اُکھاڑ کر رکھ دیا۔ طارق نے بچوں کو بلند آواز سے کہا :

"ماما کو بُلاؤ۔۔۔۔ ماما کو لے کے آؤ۔۔۔۔!"

طارق کی بیوی معصر' وقار کے ساتھ چلتی ہوئی وہاں پہنچی جہاں کام ہو رہا تھا۔ طارق نے

آگے بڑھ کر ایک اینٹ اُس کے ہاتھ میں تھما دی۔ اینٹ کھدی ہوئی کھائی میں رکھی گئی۔ پاس کھڑے ہوئے لوگوں کے ہاتھ دُعا کے لیے اُٹھے۔ وہ کہہ رہے ہیں "اے رب! تو ہماری اس ابتدا کو اُس انتہا تک پہنچا دے جس کی ہم نے تمنا کی ہے۔ بے شک دلوں کے حال صرف تُو ہی جانتا ہے----" آمین کی آواز مجھے صاف سنائی دی ہے---- یوں لگتا ہے اس "آمین" میں 'مَیں' بھی شامل ہوں۔ بلکہ پورا ماحول---- زمین سے آسمان تک شامل ہے۔ ہوا کا ایک جھونکا مجھ سے ٹکرا کر گزرا ہے۔ میں پورے کا پورا لرز گیا ہوں' شاید یہ قبولیت کی شرط ہے---- ہاں---- اللہ! تُو ایسے ہی کر جیسا میرے محبوب نے چاہا۔

بلڈنگ کے بنتے بنتے دُھند کا ایک اور موسم آیا اور چھٹ گیا۔ اس دوران مجھے طارق کی رفاقت اکثر میسر رہی۔ وہ دُھن کا پکا جوان ہے۔ اُسے مثبت کام کرنے سے غرض ہے۔ کرتا کرتا اور کرتا---- کرتے رہنے سے کچھ نہ کچھ وجود میں آ ہی جاتا ہے---- جیسے میں---- صبح شام' سردی گرمی' ایک قیام میں ہوں مگر بڑھ رہا ہوں۔ پھلتا پھولتا ہوں۔ میرے پھولوں کی خوشبو ہر خاص و عام کو لبھاتی ہے۔ لوگ میری دوسری خوبیوں کا تذکرہ کرنے لگتے ہیں تو مجھے اپنے ہونے پر ناز ہونے لگتا ہے۔ طارق سے یارانہ تو ان سب باتوں پر مستزاد ہے۔ یوں کہہ لیجیے اِک اُمنگ کی لپک ہے جس میں 'مَیں' سے اُچھل کر 'ہم' کی اڑان سے آشنا ہوا ہوں۔ اس احساس کی ترجمانی کوئی ایک لفظ کر سکے---- 'اعتماد'---- مگر اعتماد میں اندھا پن نہیں ہوتا جیسے 'محبت' میں ہوتا ہے اور مجھے طارق سے محبت ہے۔ میں اس کے لیے جان پر کھیل سکتا ہوں۔ وہ بھی محبت کے عمل سے گزر رہا ہے اور میں بھی۔ ہم دونوں مفتوحین ہیں عشق کے۔ اُسے اپنے پروگرام اور منزل سے محبت ہے۔ مجھے وہ اچھا لگتا ہے اور شاید میں بھی اُسے اچھا لگتا ہوں۔ یہ محبت بھی کیا شے ہے یوں کہ کچھ دو طرفہ تماشا ہے۔

عمارت پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ میں آپ مگن اور زندگی کے پھیلاؤ میں ہوں۔ اب عمارت پر رنگ و روغن ہو رہا ہے۔ روشنیاں نصب ہو چکی ہیں۔ رات کو بھی کام ہوتا ہے۔ کاریگر' مزدور ہروقت جُتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ طارق میرے سائے میں آکر رُکتا ہے۔ ایک دن وہ ایک کارکن سے کہہ رہا تھا :

"یار اس درخت کا کیا کریں۔۔۔؟ یہ سڑک میں آتا ہے۔"

کارکن نے فیصلہ کن لہجے میں تیزی سے جواب دیا :

"سر! اس کو کاٹ دیتے ہیں' رکاوٹ ہے خواہ مخواہ۔"

تین چار کارکنوں نے مل کر کلہاڑیوں کی مدد سے مجھے گرا دیا۔۔۔ میں ایک "شڑاپ" کے ساتھ زمین پر لیٹ گیا ہوں۔ یہ "شڑاپ" طارق کو اُداس کر گئی ہے۔ اُسے نہیں پتا کہ یہ آواز میری سسکی نہیں' اِک ماورائی قہقہہ ہے۔ اک شہادت ہے کام آنے کی۔۔۔ طارق! میرے ہر پتے' ہر ٹہنی کو توڑ' ہر بار تو ایک سرگوشی سنے گا :

"صدقے۔۔۔ صدقے۔۔۔"

میری معراج یہ ہے۔۔۔ اور شاید میں نے مراد پا لی ہے۔۔۔ لیکن۔۔۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں' ابھی کئی مراحل درپیش ہیں۔ ابھی وہ منزل نہیں آئی جو فنا کے نام سے موسوم ہے۔ اصل میں عشق کی منزل یہی ہے۔

کئی مہینے ہونے کو آئے۔ طارق! تمہارا منصوبہ تو بہار میں مکمل ہو گیا تھا۔ وہ جگہ جہاں سے میں گرا تھا تارکول اور بجری کی چادر سے ڈھک گئی۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ پھر کیا ہوا۔۔۔؟ تم نے آنا کیوں چھوڑ دیا۔ میں تمہاری درسگاہ کے پچھواڑے پڑا سوکھ رہا ہوں۔ تمہاری راہ دیکھنا میرا مشغلہ ہے۔ تم آتے تو اس پچھواڑے تک بھی آ ہی جاتے۔ تپتی دوپہروں میں تم ادھر آئے ہی نہیں۔ کام کے بعد کہیں دُور سیر سپاٹے پر نکل گئے ہو گے۔ اس دائرے سے بہت پرے اور تمہیں اس تاج محل کا خیال نہیں آیا جو تم نے اپنی پیاری بیوی کے نام پر بنوایا۔۔۔ کوئی بات نہیں۔۔۔ عشق کے نام پر بنی ہوئی عمارت یا

کہانی دُھے نہیں جائے گی۔ لگن کا میں تو کمال ہے کہ وہ کسی نہ کسی پہلو سے لازوال ہوتی ہے۔ وقت اپنی رفتار کے نشان بلاشبہ چھوڑتا ہے مگر مٹا نہیں سکتا۔ سو یہ در سگاو رہے گی۔ کب آؤ گے خبر لینے۔ ایک نہ ایک دن تو آؤ گے ہی۔ گو میں گھائل ہوں مگر یقین میں ہوں۔

موسم گرمی سے معتدل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میری ٹہنیوں پر آشیانے بنانے والی فاختاؤں اور چڑیوں نے مجھ سے مایوس ہو کر اپنے ٹھکانے بدل لیے ہیں۔ اب وہ مجھے پہچانتی بھی نہیں' اگرچہ بلڈنگ کے پچھواڑے سے بھی اُن کا روز گزر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ بلڈنگ کا چوکیدار اِدھر پچھواڑے ہی میں پکاتا کھاتا ہے۔ اُس کی بیوی بچا کھچا مجھ پر ہی جھاڑتی ہے اور یہ فاختائیں اور چڑیاں دانا دُنکا چگنے ادھر آ نکلتی ہیں---- میں ان کے ننھے ننھے پنجوں کے لمس سے آشنا ہوں مگر یہ البیلیاں مجھے نہیں پہچانتیں۔ سچ کہتے ہیں' پنچھیوں اور پردیسیوں کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔ ابھی یہاں ابھی وہاں---- پہچان ٹھکانے پکے کرنے کی دلیل ہے اور دستگیری ایک اور خوبی۔

آج کون سا دن ہے بھئی---- تیز آوازیں اور ہماہمی---- کوئی آنے والا ہے---- اس کارخانے کا مالک ہی ہو گا---- طارق۔ صرف شور شرابا نہیں اور بہت کچھ۔ دیگیں کھڑکھڑ کھڑک رہی ہیں۔ برتن اِک دوجے سے ٹکرا کے مستی کا اظہار کر رہے ہیں' پٹ رہے ہیں' بج رہے ہیں یا پھر یہ سب اور نوکر چاکر مل کر کوئی نغمہ کمپوز کر رہے ہیں جو سُر میں آنے کے لیے بے قرار ہے۔ کچھ ہونے والا ہے۔ ہوا بھی آج کچھ زیادہ ہی تیز چل رہی ہے اور اُس کا رُخ بھی اِدھر ہی ہے۔

"لکڑی کم پڑ گئی سر! اب کیا کریں سر؟"

یہ کسی باورچی کی گھبراہٹ بھری بلند آواز ہے۔

باورچی کے ایک آدمی نے مجھے دیگ کے نیچے دہکتی آگ میں جھونک دیا ہے---- طارق کی بیوی بلڈنگ کے بیک ڈور سے برآمد ہوئی ہے۔ دونوں بچے بھی ساتھ ہیں۔ ایک

دوسرے کے پیچھے دوڑتے۔

معبر' جسے میں بانو بھی کہتا رہا ہوں' تشویش سے پوچھ رہی ہے:

"ابھی کھانا تیار نہیں ہوا کیا؟"

"ابھی ہوا چاہتا ہے---- بیگم صاحب! لکڑی کم پڑ گئی ہے---- یہ درخت کام آیا---- میں نے اس کی پھاڑیں بنا کر جھونک دی ہیں۔"

باورچی کے آدمی کا لہجہ خاصا داد طلب ہے۔ خوشامدانہ نہیں کہوں گا۔ آگ بھڑک اٹھی ہے۔ طارق کی بیوی کی آمد نے میری آتشِ شوق کو جانے کیوں بھڑکا دیا ہے---- دیکھنے والے کہتے ہیں---- 'اب بھڑکی ہے آگ'---- اور میں ہوں کہ حالتِ رقص میں ہوں۔ وہ آ کے دیکھے تو سہی کہ میں اُسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ دیکھے کہ میں دہکتی آنکھیں بن گیا ہوں اور اُسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میری تمنا مجھے' مجھ ہی میں سوختہ کئے دے رہی ہے۔ جلتی لکڑیاں تڑخ---- صدقے۔ صدقے تیرے صدقے---- لو وہ آ گیا---- ہاں شنید دید ہو گئی۔

میں نے اُسے دیکھ لیا۔ دیگ دَم پہ ہے اور میں شادکام ہوں' جیسی میں نے تمنا کی تھی۔ میں نے چاہا تھا اور چاہتا رہا ہوں کہ میں اس کے کسی کام آ سکوں۔ طارق کے چہرے پر ایک طمانیت ہے۔ اُس کے ارادوں سے بجی ہوئی دلکشی' میں اپنی بجھتی ہوئی آنکھوں سے بھی دیکھ سکتا ہوں۔ میں شادکام ہوں کہ اُس نے مجھے زندگی کے دھارے میں شامل کر لیا۔ بلاشبہ میں شامل ہوں اس کے ارادے میں' کام میں---- شکریہ طارق۔

الوداع---- الوداع---- پھر ملوں گا۔ ان شاء اللہ۔

OOOOO

میں اللہ رکھی ہوں

کیاں کہوں---- ؟ میں کون ہوں' بس مجھے اتنا پتا ہے کہ انسانوں کی بستی میں رہتے ہوئے مجھے' اپنے آپ کو انسان ہی کہنا چاہیے۔ سمجھ لیجیے میں انسان ہوں۔ اس ہونے نہ ہونے کا مجھے زیادہ علم نہیں۔ ہونا کیا ہے اور کیسے ہو جاتا ہے' بس ہو جاتا ہے' خبر ہی نہیں ہوتی---- دیکھو نا کیسے پتا چلے کہ کون کرتا ہے اور یہ سب کیوں کرتا ہے۔ کوئی نہ کوئی تو ذمہ دار ہے۔ کہیں نہ کہیں کوئی بجلی ہے اور اس بجلی کو چلانے والا ہاتھ بھی ضرور ہے کیوں کہ ہاتھ کے بغیر کوئی بھی حرکت عمل میں نہیں آتی---- اب مجھے ہی دیکھو' میں مسلسل کام کرتی ہوں۔ کرتی ہوں تو پیٹ بھر پاتی ہوں' نہ کروں تو بھوکی مر جاؤں۔

لوگ کہتے ہیں کہ کرنے والا تو اوپر بیٹھا ہے۔ اُس کے جو جی میں آئے کرتا ہے۔ میں اور آپ کون ہیں---- ؟ اُس کی مرضی۔ وہ قادر جو ہوا۔ اُس کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں اُس کے کاموں میں دخل دو تو وہ غصہ کرتا ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ وہ غصہ کیوں کرتا ہے۔ سب کچھ خود کرتا ہے تو پھر اُسے غصہ کیوں آتا ہے' اپنے کیے پر۔

خیر---- میں جو بھی ہوں' جیسی بھی ہوں---- میں اللہ رکھی ہوں---- میں اللہ رکھی کیوں ہوں!---- میں پیدا ہوئی' میری ماں نے میرا نام اللہ رکھی رکھ دیا۔ سو میں شروع دن ہی سے جانتی ہوں کہ میں اللہ رکھی ہوں۔ سنا ہے اللہ رکھی نام اُن لڑکیوں کا رکھا جاتا ہے جو بہت مہنگی' بہت لاڈلی ہوں۔ ماں باپ کے بہت سے بچے مر چکنے کے بعد

پیدا ہونے والے بچے یا بچی کا نام عام طور پر اللہ رکھا' رکھا جاتا ہے یا اللہ رکھی۔

میں منگی ہوں' لاڈلی ہوں۔ آس مُراد کی اولاد ہوں' اس کا تجربہ مجھے بالکل نہیں اور نہ میں نے خود کو ایسا کبھی محسوس کیا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد میں نے خود کو کئی طرح سے دیکھا۔ کئی صورتوں میں پایا۔ بچپن میں جب مجھے شعور آیا ہی تھا' ماں کی چھاتی میں سمٹ کر لوگوں کے گھروں میں جانا مجھے اچھا لگتا تھا۔ کیا رنگا رنگی تھی ماں کی گود میں چڑھ کر جانے میں۔ دُنیا کا میلا دیکھنے میں بڑا مزا آتا تھا۔ ہر گھر اِک الگ میلا ہوتا تھا۔۔۔۔ نیا۔۔۔۔ پھر ماں مجھے کسی شے کی طرح گھر کے کسی کونے میں' گھر کے مالکوں کی نظروں سے دُور بٹھا کر کاموں میں جت جایا کرتی تو مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ شاید میں رو دیتی تھی تو ماں کام میں جُتے جُتے وہیں سے پکارتی :

"رکھیے! نہ رو میری دھی۔۔۔۔ بُنے آئی۔۔۔۔"

میں ماں کی آواز سنتے سنتے سو جاتی تھی۔ آنکھ کھلتی تو کوئی اور گھر ہوتا تھا کیوں کہ اس گھر کی مہک پہلے گھر سے مختلف ہوتی تھی۔ آپ جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں کہ ہر گھر کی مہک دوسرے گھر سے الگ ہوتی ہے۔ پھولوں کی طرح اپنی پہچان آپ۔ دھوپ کا' سایوں کا' آوازوں اور رنگوں کا علم تو مجھے بہت بعد میں ہُوا کہ یہ بھی پہچان کرنے میں مدد دیتے ہیں اور بہت دیتے ہیں۔ بلکہ یہی پہچان مقرر کرتے ہیں۔ ان سب واسطوں ہی نے تو مجھے بتایا کہ میں "اللہ رکھی" ہُوں۔ باقی جو کچھ ہُوں اسی ہونے میں ہُوں۔ اسی ہونے کے ہوتے ہوتے میں بڑی ہونے لگی' جیسے سب ہوتے ہیں۔

ماں کہا کرتی تھی یہ سب اوپر والے کے کام ہیں۔ وہ جس کو چاہے جیسے رکھے۔ رکھے نہ رکھے۔ سب اُس کے ہاتھ میں ہے کیوں کہ بجھتی پر اُسی کا ہاتھ ہے۔ جس کو چاہے مالک بنا دے' جس کو چاہے نوکر۔ انسان وہی جو راضی بہ رضا رہے۔

میرے بڑا ہونے کے دوران ماں نے کئی گھر بدلے۔ وہ تھوڑی اُداس رہنے کے بعد پھر چل پڑتی تھی۔ راضی بہ رضا۔ کام سے کام' خوشی غمی' سب اُس کے ہاتھ میں ہے۔ وہی جس کا بجھتی پر ہاتھ ہے۔ ماں اکثر کہا کرتی تھی' ماں کیا؟ سب لوگ کہتے ہیں۔۔۔۔ قبول۔۔۔۔ قبول۔۔۔۔ قبول۔۔۔۔ اسی میں بھلائی ہے۔

اُس روز نہ جانے کیوں' ماں کو بجھتی والے ہاتھ میں کچھ لرزش نظر آئی جب اُس نے

میرے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ کر' مجھے اُس بڑی سی کوٹھی کے بڑے گیٹ کے باہر دھکیلا۔ پھر مجھے پکڑے پکڑے سڑک پر بھاگتی ہوئی اپنی کوٹھڑی تک پہنچ گئی اور پٹ لگا کر رونے لگی۔ اس کوٹھڑی کو ہم اپنا گھر کہتے ہیں۔ باقی سارے گھروں سے الگ۔ اس کی بھی اپنی مہک تھی۔

ماں کو نہ معلوم کیا دورہ سا پڑا' وہ مجھے اپنے ساتھ دبائے کچھ کہے جاتی تھی اور اُس گھر کے آنگن سے دوڑ کر باہر آگئی تھی۔ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ لیکن اتنی بات میرے دل میں جانے کیسے آگئی تھی کہ کوئی دُکھ کی بات ہے ضرور۔ میں زور زور سے چلّانے لگی تھی۔ حالانکہ ماں کے سینے جیسی جنت میں کوئی روتا ہے بھلا۔۔۔؟ لیکن اس جنت میں منہ دے کر دھاڑیں مارنے کا بھی اپنا مزا اور سواد تھا۔

پھر میں کچھ اور بڑی ہو گئی۔ پاؤں پاؤں چلتی' اب میں اپنے آپ کو بڑا ہوتا محسوس کر رہی تھی۔ بڑا ہونا مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ جوش ہی جوش۔ اُمنڈتی ہوئی خوشیاں میرے وجود کی دیواروں پر جھمکے کی بیل کی مانند پھیل رہی تھیں۔ جھمکے کے سفید سے گلابی اور گلابی سے عنابی ہوتے بیچ بیچ پھول جو ہمارے کام والے ہر گھر میں کہیں نہ کہیں گچھوں کی شکل میں اپنی سوگندھ پھیلائے رکھتے تھے' بہت اچھے اور پیارے لگتے تھے مجھے۔ جی چاہتا تھا یہ میرے گھر میں بھی ہوں مگر میں خود کو ہی گلابی سے عنابی ہوتی ہوئی محسوس کر رہی تھی۔ میرے گھر کی ایک کوٹھڑی ہے جس کو صاف کرنے کا بھی موقع نہیں ملتا ہم ماں بیٹی کو۔ ہم بہت مصروف لوگ ہیں۔ ماں کی مصروفیت کی تو بات نہ پوچھو۔ ہروقت مکھی کی طرح بھن بھن کرتی بجتی رہتی ہے۔ اب تو جب وہ چھوٹے بھائی کو لوری گا کے سلاتی ہے تب بھی مجھے ایسے لگتا ہے جیسے وہ بھنبھنا رہی ہے محض عادتاً۔ لوری گانا یا بھنبھنانا ایک عادت ہے عمر میں رہنے کی۔۔۔۔ اور میری ماں تو ہم دس بہن بھائیوں کو لوری گا گا کر بہلا چکی ہے۔ بھلے اب ہم صرف پانچ ہیں' پانچ کو بچپنے ہی میں شاید سمجھ آگئی کہ بھیا۔۔۔! دنیا میں سب کچھ ٹھیک نہیں' چلو واپس۔ جہاں سے آئے ہیں' وہیں ٹھیک ہے۔ اور وہ باری باری اپنے حساب سے چلے گئے۔ اب ہم رہ گئے پانچ' تین بہنیں اور دو بھائی۔ ماں کہتی ہے بھائیوں کی خیر مانگا کرو۔ میں ہمیشہ بھائیوں کے لیے دُعائیں مانگتی رہتی ہوں۔۔۔۔ اللہ اللہ' وہ ٹھیک رہیں۔ جلدی جلدی بڑے ہو جائیں۔ ہم بہنوں اور ماں باپ کا سہارا بن جائیں۔

مگر وہ جلدی جلدی بڑے ہوتے ہی نہیں۔ ہم بہنیں ہیں کہ لپ جھپ بڑی ہوتی جا رہی ہیں۔ ماں کو جب ہم پر پیار آتا ہے تو دلار سے کہتی ہیں۔ 'بیٹی کا دھن' کڑوی تیل' دنوں میں جوان۔۔۔۔' اور جب ماں ہم سے تنگ ہوتی ہے تو جھنجلا کر کہتی ہے۔۔۔۔ 'یہ جھاڑ بوٹی اپنے آپ پھیلتی سر کو آجاتی ہے کمبخت۔ لاکھ پھینکو' ہٹاؤ مگر یہ آکاش بیل' اس کو تو بڑھنے سے کام۔ لٹکنے بکنے سے کون روکے۔۔۔۔' اماں کچھ بھی کہے' بڑھنا میرے بس میں نہیں۔ اب میں اتنی بڑی ہو گئی ہوں کہ ماں سے الگ خود ہی گھروں کا کام سنبھال سکتی ہوں۔۔۔۔ میرے پاس آج کل تین گھر ہیں۔۔۔۔ ذمہ داری سونپتے ہوئے ماں نے مجھے کچھ باتیں سمجھائی تھیں۔ کہا تھا :

"نظریں نیچی رکھنا۔ آواز میں لوچ نہ آنے دینا۔ سر اور سینہ ننگا نہ رہے۔ میری یہ باتیں پلّے باندھ لو۔"

ماں کی بتائی ہوئی باتوں پر میں نے عمل کیا۔ کافی دیر تک سب کچھ ٹھیک ہی چلتا رہا۔ سوائے اس کے کہ ماں رات کو میرے باپ سراج کو جھنجھوڑ کر تقریباً روز ہی یاد دلاتی تھی۔ خاص طور پر آدھی رات گئے۔ شاید اُس وقت' جب ماں کے خیال کے مطابق' ہم سب سو چکے ہوتے تھے۔ سارے دن کا تھکا ہوا' نڈھال' بے سُدھ بدن نیند کے ہلکوروں میں۔۔۔۔ ہائے میرا دل لپک کر گلے میں آ گیا۔ ماں کہہ رہی تھی :

"سا جے! پتا ہے' بیٹی جوان ہو گئی ہے۔۔۔۔"

"ہاں۔۔۔۔ ہاں اللہ رکھی کی ماں۔۔۔۔ تم ہر روز یہی ایک بات دُہراتی ہو۔۔۔۔ میں کر رہا ہوں۔۔۔۔ بیٹی' باپ کے دل میں ماں سے پہلے کھٹکا کرتی ہے۔ میں کوئی اندھا بہرہ نہیں۔ بھولی نہ ہو تو۔"

مجھے خبر ہے میری ماں بھولی تو ہے مگر بے عقل نہیں اور میں۔۔۔۔؟ مجھے تو بڑھنے سے کام ہے۔ کام کرنے سے کام ہے اور بس۔ ابھی پچھلے دنوں میرے ایک گھر میں لڑکی کی شادی تھی' باجی نجّو کی۔ ہم لوگ سب گھر والیوں کو باجی ہی کہتی ہیں۔ شادی تو بڑی شاندار تھی۔ بسم اللہ سے لے کر بدائی تک شان ہی شان۔ پر نجّو باجی پہلی رسم سے لے کر آخری وقت تک روتی ہی رہی۔ جانے اُسے کیا دُکھ تھا؟ کسی کو بتایا نہیں۔ ہاں اتنا یاد ہے جب وہ پھولوں سے لدی گاڑی میں سوار کی جانے لگی۔ رسم کے مطابق خاندان کے ہر

چھوٹے بڑے فرد سے گلے ملنا' پیار لینا' دعائیں سمیٹنا ضروری ہوتا ہے۔ بڑھ کر جو بھی گلے لگا کے۔ عمر اور مرتبے کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا۔ بڑھ کر لپٹ جاتے ہیں۔ آنسوؤں کے پردے سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ نجّو باجی سے میں بھی لپٹ گئی۔ میں تو صبح سے بدائی کی اس گھڑی کے لیے نجّو باجی کے آس پاس منڈلا رہی تھی۔ میرے بعد نجّو کی بڑی پھوپھی نے آگے بڑھ کو نجّو کو باہوں میں لے لیا اور بڑبڑائی :

"دھیے! انویں رو رو نہ ڈیے۔۔۔۔ 'جتھے ماپے رِن او تھے ڈیے۔"

یہ بول نجّو نے یاد رکھے یا نہیں' میرے دماغ میں تو ایسے گڑے ہیں کہ اب تک نہیں بھولی۔ میں ان پڑھ عورت جیون کے چالیس برس بھگت چکی ہوں مگر یہ بول مجھے اکثر موقعوں پر یاد آجاتے ہیں۔ اپنے لیے بھی' دوسری کے لیے بھی۔ اپنے لیے تو بہت زیادہ۔ میں نے بتایا نا کہ میری ماں' میرے باپ کو میری شادی کے لیے کہتی رہتی تھی۔ ایک دن میرا باپ' ماں کے سامنے سرخرو ہو کر مسکرایا۔ یہ ابّا کے چہرے کی مخصوص مکرپلی مسکراہٹ ماں ہمیشہ بھانپ لیا کرتی تھی۔ چِڑتی تو ہماری کوٹھڑی دونوں کی تو تکار سے پھٹنے لگتی۔ معاملہ ماں کی یا کسی بچے کی ٹھکائی کے بعد ٹھنڈا ہو جاتا۔ مگر اب کے باپ کے چہرے کی مکرپلی مسکراہٹ کئی دن تک پھیلتی سکڑتی رہی۔ وہ جواری تھا نا۔ مکر اور فریب میں جتلا رہنا اُس کی کمزوری تھی۔

پر آج والی مسکراہٹ میں مجھے اپنا آپ پھنسا ہُوا' بھیگا ہُوا' لپٹا ہُوا سا جانے کیوں لگ رہا تھا۔ جیسے اس مسکراہٹ میں کہیں نہ کہیں میں تھی۔ ہاں میں ہی تھی۔ ماں باپ بچوں کو بے شک کتنا ہی بھولا سمجھیں' کتنا ہی بھولا رکھیں' گزرتا سمے بچوں کو آپ ہی آپ بہت کچھ بتا دیتا ہے۔ البتہ ہوشیار بچے ماں باپ کی خوش فہمی کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

دوسری رات جب ہم کھا پی کر بستروں میں گھس گئے تو باپ نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے غن غنی آواز میں ماں کو پکارا :

"معراج بی بی۔۔۔۔ اے ماجھاں!"

میری ماں' معراج بی بی نے کوئی جواب نہ دیا تو باپ نے مخصوص فقرہ دُہرایا :

"ایک تو تُو شام سے ہی سونے کا کرتی ہے۔۔۔۔ تیری بیٹی کا قضیہ نبیڑ آیا ہوں۔ مبارک

ہو۔

"میری بٹی! تیری نہیں؟" ماں چونک کر بولی۔

"او ہوئی بول کہاں والیے۔۔۔۔۔۔ ماجھاں۔۔۔۔!"

پھر سناٹا چھا گیا۔ جیسے چھوٹے بڑے سب سو گئے ہوں۔

ان ہی دنوں مجھے پتا چلا کہ مجھ سے پہلے' میرے تین بہن بھائی مر چکے تھے۔ اسی لیے میرے ماں باپ نے متفقہ طور پر میرا نام اللہ رکھی رکھ دیا۔ سو میں پیدائش سے اب تک اللہ رکھی ہوں۔ کہتے ہیں نام میں بڑے بھید چھپے ہوتے ہیں اس لیے نام سوچ سمجھ کر رکھنا چاہیے۔

میں 'میاں دی بیٹھی' کی بغل میں سے گزر رہی تھی تو وہ ایک دم جانے کہاں سے ٹپک پڑا۔ سستے عطر کی خوشبو نے مجھے جھلا کر رکھ دیا۔ میں نے تیزی سے مڑ کر دیکھا وہ کون ہے؟ میں نہیں جانتی تھی اُسے۔ نہ اس سے پہلے میں نے اُسے دیکھا تھا۔ اُس کے اطوار بتا رہے تھے کہ وہ کسی طرح سے جانتا ہے مجھے۔ پھر وہ ساتھ ساتھ چلتے چلتے بتانے لگا:

"رکھیے! میں تیرے ابے کا یار ہوں۔ تینوں تیرے ابے نے نہیں بتایا کہ تیرا میرا بیاہ ہونے والا ہے۔"

میں نے چکرا کر اُس کی طرف دیکھا۔ پنتالیس پچاس کے پیٹے میں ہو گا۔ اچھا سرخ و سپید رنگ' گھٹا ہوا سر' ملتانی لنگی پر سفید وائل کا لمبا کُرتا' پاؤں میں پینٹ لیدر کی سیاہ چپلی۔ منہ میں پان کی گلوری' آنکھوں میں کئی کئی سلائی سُرما بھرا ہوا۔ حلیے سے وہ میرے باپ کا یار ہی تھا۔ میرے باپ کی طرح جیسے ابھی ابھی کسی تکیے سے چوسر کی بازی بیچ میں چھوڑ کر آیا ہو۔

میرے باپ میں کئی بُرائیوں اور اچھائیوں کے ساتھ ایک عادت بہت پکی تھی کہ وہ بات کر کے بھول جاتا تھا۔ یاد دلاؤ بھی تو وہ ہنس کر جواب دیتا۔۔۔۔ 'بھُول گیا ہوں۔۔۔۔'

میری ماں ماجھاں اس کی اس عادت سے واقف تھی اور اکثر جُوئے اور نشے کی وجہ سے شرمسار' کسی کونے میں ڈھیر ہوئے میرے باپ کو کھانا نہیں دیتی تھی۔ اگلی صبح سراج کچھ گڑبڑایا اور کمزور سی آواز میں کہتا:

"مجھے تو زور کی بھوک لگی ہے ماجھاں! لگتا ہے رات میں نے روٹی نہیں کھائی۔ تو نے دی نہیں' میں نے کھائی نہیں----"

ماں ہنس کر کہتی :

"کیوں جھوٹ بولتے ہو ساجے! کھا کے بھول جاتے ہو۔"

"بھولنا اچھی عادت ہے جھلیے! آدمی بھولے نہ تو یاد کر کر کے مرجائے۔ جیسے تو اپنے پانچ بچوں کو بھول گئی۔ کتنا اچھا ہوا کہ تو گربھ کا بوجھ اٹھا کے' جنم دینے کی پیڑ سہ کے بھول گئی۔"

"ساجے! اچھا ہی ہوا۔ دس کو کیسے پالتے۔"

ابا بھولنے کو ایک اچھی بات کہتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ انسان اگر بھولتا نہ تو ترقی نہ کر پاتا۔ اب دیکھو تو کہاں کہاں کمندیں ڈالتا پھرتا ہے۔

میرے باپ کو ہار جانے کے بعد جیتنے کی بھی عادت نہ تھی۔ جس سے میری ماں بہت چڑتی تھی۔ غصے میں پاؤں پٹختی کام پر نکل جاتی۔ شام کو تھکی ماری' ٹھنڈی ٹھار لوٹتی تو ابا نیند پوری کر چکا ہوتا۔ پھر دونوں مل کر ہم بچوں کی ڈانٹ پھٹکار کرتے۔ بس یہ معمول تھا ہمارے گھرانے کا۔ بہت بعد میں مجھے پتا چلا کہ غریب کا کوئی گھرانا نہیں ہوتا۔ پھر بھی میرا گھرانا تو تھا کہ ہم جتنے بھی بہن بھائی تھے سب کے سب ایک باپ اور ایک ماں کی اولاد تھے۔ عام طور پر ہمارے طبقے میں ہوتا یہ ہے کہ مرد اپنی جوانی میں' حکمرانی میں اپنی عورتیں بدل ہی لیتا ہے۔ عورتیں بھی ایسا کر سکتی ہیں۔ مذہب اور معاشرہ عورت کو بھی اجازت دیتا ہے۔ اسی لیے تو یہ محاورہ گھڑا گیا ہے۔

حق کر حلال کر---- اِک کر ہزار کر----

اللہ رحم کرے۔ گھڑنے والوں نے یہ بکت گھڑ تو لیا مگر عملی طور پر عورت کے لیے ناممکن ہے کیوں کہ وہ پھنس جو جاتی ہے جذبات کی گھمن گھیری میں۔ ممتا کا پھندا سب سے کڑا پھندا ہے۔ اُس کی طاقت' ارادے' فیصلے اور وعدے سب ڈھیر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ایسی ہی کچھ میری ماں بھی تھی۔ کئی بار طلاق ہوتے ہوتے ٹلی۔ کئی موقعوں پر ابا نے اماں کو بازو سے پکڑ کر گھر سے باہر کر دیا۔ مگر وہ کوٹھڑی کی چوکھٹ مضبوطی سے پکڑ لیتی۔ گھونسے کھاتی رہتی اس مرد سے' جسے ہم ہمیشہ باپ ہی کہیں گے کیوں کہ ماں ہمیشہ

اُسے "تمہارا باپ" کے نام سے یاد کرتی تھی۔ جانے کیوں؟ ماں کے لیے ضروری تھا کہ ہر وقت' ہر لمحے دُہراتی رہے کہ تم باپ ہو۔ اور بچو! یہ مرد جو گھر میں رہتا ہے' تمہارا باپ ہے۔ سیدھے نام سے نہ پکارنے میں کوئی مصلحت تھی جسے میں بہت دیر بعد سمجھنے کے قابل ہوئی۔ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ بیویاں کُل کے اس مرد کا نام لینے سے احتراز کرتی ہیں جو عملِ آبادکاری میں اُن کا برابر کا ساتھی ہوتا ہے۔ وہ شرماتی اور جھجکتی کیوں ہیں؟ ہر طبقے کی عورت شرماتی ہے اُس کے سامنے نظریں ملا کے بات کرتے ہوئے۔ حتیٰ کہ پیٹھ پیچھے بھی عجب طرح کی ہچکچاہٹ اُن کے چہروں اور آنکھوں سے جھلکتی ہے۔ ممکن ہے میرے چہرے پر بھی نظر آتی ہو۔ آنی تو نہیں چاہیے' مگر آتی ہے۔ مجھے لگتا ہے آتی ہو گی دیکھنے والوں کو۔

میں نے کچھ کام ایسے کیے ہیں جس سے مجھے احساس ہُوا کہ میں اپنے طبقے کی عام عورتوں جیسی نہیں ہُوں۔ بس میں اللہ ہی رکھی ہوں۔ جبھی تو ابھی تک جی رہی ہوں۔ بے شک جسے رب رکھے اُسے کون چکھے اور اب میں کبھی کبھی قیاس کرتی ہوں کہ شاید یہ میرے نام کا اثر ہے۔ ورنہ میں نے اپنی موت کا بندوبست کرنے میں کبھی کسر نہیں چھوڑی۔ اب دیکھو نا۔ باپ ہی داؤ لگانے والا تھا میرے ساتھ۔ بھاؤ لگا دیا اُس نے میرا۔ وہ تو ماں کی رُوح کو قرار ملے قیامت تک' بیچ میں آ گئی۔ معاملہ ایسے ہی رفع دفع نہیں ہُوا۔ کشٹ اٹھانا پڑا میری جان کو۔ ماں نے مجھے جو سہارا دیا سو دیا۔ ابا تو میرے بالکل خلاف ہو گیا تھا۔

ہُوا یُوں کہ جس دن اُس پان خور جوارے نے راستے میں مجھے روک کر خبر سنائی۔ میں گھر پہنچتے پہنچتے ہنڈیا کی طرح اُبل رہی تھی۔ جاتے ہی اماں سے لپٹ گئی۔

"اماں ــــ اماں ــــ مجھے مار دو ــــ بس مجھے مار دو ــــ"

اماں نے ایک دھول جما کر پرے ہٹانے کے بجائے مجھے باہوں میں تو لے لیا مگر پوچھے چلی گئی :

"کمبخت ــــ کچھ بتائے گی بھی ــــ"

اور جب میں نے ماں کو بتایا کہ ابے نے مجھے اِک مسٹنڈے کے ہاتھ بیچ دیا ہے اور اُس مسٹنڈے نے مجھے خود بتایا ہے تو ماں جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ گویا یہ کوئی بات ہی نہ تھی۔

میں ایسے ہی تڑپ رہی تھی بلاوجہ۔ اماں نے مجھے بتایا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں اور تُو اپنے آپ کو اُن گھروں کی بیٹی کب سے سمجھنے لگی جہاں تُو کام کرتی ہے۔ ارے وہ' وہ ہیں' ہم ہم ہیں۔ مالدار لوگ بیٹیوں کے لیے بر خریدتے ہیں۔ غریب لوگ بیوی بنانے کے لیے عورتیں خریدتے ہیں' حساب برابر۔ ایسے ہی ہوتا ہے بیٹی! یہ دنیا---- سوداکاری' سرمایہ کاری ہے مگر تیرے دماغ سے یہ بات نکل جانی چاہیے کہ تم جن گھروں میں کام کرتی ہو' ویسی بیگم یا بیٹی ہو۔ سب کا اپنا اپنا دائرہ ہے۔ ایک دائرے سے سیدھے سبھاؤ نکلنا بہت مشکل کام ہے اور پھر دوسرے دائرے میں شامل ہونا اور زیادہ مشکل۔

خوشبو میں ڈوبے' صاف ستھرے ماحول میں رہتے ہوئے تمہاری عمر میں ایسے ہی خواب دیکھنے لگتی ہیں لڑکیاں---- اچھا یہ بتا' دیکھنے میں کیسا ہے؟ جسے تو مسٹنڈا کہتی ہے۔ اماں میرے ساتھ ہی لیٹ گئی اور پھر کرید کے پُوچھا' تیرے باپ جیسا ہے----؟ تو پھر ٹھیک ہے۔ لڑکیوں کو اپنے باپ جیسے مرد تو اچھے لگا کرتے ہیں اور تجھے وہ مسٹنڈا لگا۔ آ لینے دے تیرے باپ کو' اُس سے بات کروں گی---- اور دیکھ تجھے وہی ملے گا جو اللہ نے تیرے لیے بنایا ہے اور اِدھر اُدھر مت دیکھنا' نہیں تو دُکھی ہو جائے گی۔

سمجھ تو میں گئی ماں کی بات۔ پر باپ مجھے باپ کی جگہ ہی ٹھیک لگ رہا تھا۔ نہ ذرا کم' نہ کچھ زیادہ۔ پتا نہیں ابّے نے کتنے روپے ایڈوانس میں پکڑے تھے اُس مسٹنڈے سے۔ میں اُسے اِسی نام سے پکاروں گی۔ بے شک میرے باپ جتنا ہے مگر مجھے نام نہیں آتا اُس کا۔ پھر کیسے بات آگے چلے۔ کیسے علم ہو کہ بابا نے میری کیا "سائی" وصول کی ہے اُس سے۔ ماں سے پوچھوں؟ وہ خود نہیں جانتی اُسے کیسے علم----؟ اور پھر ماں تو ایک دم ابّے کا دم بھرنے لگی ہے۔ پتا نہیں میرا دم کیوں گھٹتا ہے یہ سوچ کر کہ مجھے میرے ابّے نے بیچ دیا ہے۔ جی ہے کہ مانتا نہیں۔ عجب اُلجھن آ پڑی ہے۔ یہ ایک اکیلا وقت ہے جو مجھ اکیلی جان پر آ پڑا ہے۔ میں اپنے آپ کو بہت اکیلا پا رہی ہوں۔ بس میں ہوں---- اور میرا مسئلہ ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ کوئی میری مدد کرے گا سوائے اللہ کے۔ اب تک سب کو یہی کہتے سنا ہے کہ اللہ مدد کرنے والا ہے۔ جس کا کوئی نہ ہو' اُس کا خدا ہوتا ہے۔ یوں تو خدا مجھے کبھی نظر نہیں آیا مگر اماں کا خیال ہے کہ خدا گنہگاروں کو نظر نہیں آیا کرتا۔ اماں کا یہ بھی قیاس ہے کہ خدا غریبوں' بھوکے ننگوں کو نظر نہیں آیا کرتا کیوں کہ

وہ غریب ہوتے ہیں۔ پھر بھی اُسے کبھی بھولنا نہیں چاہیے۔ وہ ہر جگہ ' ہر وقت رہتا ہے۔ اماں جو کہتی ہے ' سچ ہی ہو گا۔ اماں کی اماں نے بھی اپنی ماں سے اِسی قسم کی باتیں سنی ہوں گی تبھی تو اُس نے پلّے باندھ رکھی ہیں۔ یہی کہ غریب کو بس اپنا ایمان مضبوط رکھنا چاہیے۔ باقی باتیں اور چیزیں آنی جانی ہیں۔ وقت ان کو فنا کر دیتا ہے صرف ایمان ہی انسان کے بس میں ہے۔ جسے سنبھال کر رکھنا اس کے لیے لازم ہے۔ اس کے پاس امانت ہے اللہ کی طرف سے سونپی ہوئی۔ میں نے ماں سے ایمان کے بارے میں کھل کر بتانے کو کہا مگر اس نے جھڑک کر مجھے خوفزدہ کر دیا۔

"خبردار! ایمان اور اللہ کے بارے میں زیادہ نہیں کریدتے۔ سیدھی جہنم میں جاؤ گی کمبخت۔"

ماں تو کہتی تھی کہ تُو اس مسٹنڈے کے بارے میں بھی زیادہ مت سوچ۔ تیرے باپ نے اُس کے ساتھ بات کی ہے ' تو ٹھیک ہی ہو گی۔۔۔۔؟ کیوں شرمسار کرواتی ہے اپنے باپ کو۔ اُس نے روپے لے لیے ہیں تو کھا اُڑا چکا ہو گا۔ کہاں سے واپس کرے گا۔

اُس وقت جانے میرے بھیجے میں کیسے ایک بات آ گئی۔ میرے منہ سے ' پھٹ سے نکل گیا :

"ماں! وہ پیسے میں واپس کروں گی۔ گھروں میں کام کر کے ' محنت کر کے۔۔۔۔ کیونکہ میں اپنے آپ کو بکاؤ نہیں سمجھتی۔ میں مال مویشی نہیں ہوں۔ بس تُو ابّے سے اتنا پُوچھ کر بتا دے کہ روپے کتنے ہیں؟ میری پیاری اماں ' میری اچھی اماں ' بس تُو اتنا پوچھ دے میری قیمت کیا لگی؟ میری قیمت کیا ہے؟ مجھے ابّا نے کتنے میں ہارا؟"

بڑبڑاتی بڑبڑاتی ' میں ماں سے دلار کرتے کرتے سو گئی۔ ایسا لگ رہا تھا میں کہیں اوپر اور اونچی ' جگہ چڑھتے ہوئے بے حال سی ہو گئی ہوں تبھی تو نیند نے مجھے اپنی پُرسکون گود میں لے لیا اور شاید ماں میری کمر پر اپنا ممتا بھرا ہاتھ ہولے ہولے پھیرتے ہوئے بھنبھنا رہی تھی۔ لوری کی بھنبھناہٹ یا بھنبھناہٹ بھری لوری۔ جس میں سُر تو تھا ہی ' باتیں بھی تھیں دُکھ میں لپٹی ہوئیں۔ اُس جیسی نیند پھر آگے زندگی میں کم کم ہی آئی۔ بھروسے بھری اور نچنت۔

ماں مجھ سے اب بات بے بات پوچھتی :

"سچ رکھی! یہ تیرا آخری فیصلہ ہے۔ سوچ لے۔ ہے یہ مشکل کام۔"
"ہاں ماں! اگر تو میرے ساتھ ہے' مجھے کوئی فکر نہیں۔ میں اللہ رکھی ہوں تو بس اللہ رکھے گا مجھے۔"

اب وقت تھا کہ چڑیوں کی طرح پھُر پھُر اُڑا جاتا تھا۔ وہ تو شکر ہے اللہ کا مجھے کام کے لیے ایک اور گھر مل گیا اور لاکھ لاکھ شکر---- کہ یہ بھلے لوگوں کا گھر تھا۔ اچھے اور بھلے مانس لوگوں کا ملنا بھی انسان کے اپنے مقدر میں ہوتا ہے۔ نہیں تو بڑی خواری ہے۔ ماں ہمیشہ گھر سے نکلتے ہوئے دُعا کر کے آگے قدم بڑھاتی تھی---- "اے خدا! نیک بندوں کو ماتھے لگانا----" ماتھے لگنے لگانے کا مطلب میں تب سے سمجھ رہی ہوں اور دوسروں کو بھانپنے کی کوشش کرتی ہوں۔ صحیح غلط فیصلے کو بھی اسی طرح دیکھتی ہوں کہ جو دل میں خیال اُبھرا ہے' اُس کے آس پاس' آگے پیچھے' اوپر نیچے کیا ہے؟ میں کہاں ہوں' مجھے کہاں ہونا چاہیے۔ اپنے ہی اندر سے اٹھنے والے خیالات اور سوالات مجھے گھیرے رکھتے تھے اور میں اپنے کام میں جُتی رہتی تھی---- مگر گدھے یا بیل کی طرح نہیں۔ اس بات کا مجھے شدت سے احساس تھا کہ میں انسان ہوں' گدھا بیل ہرگز نہیں۔ بے شک میں جاندار ہوں باقی جانداروں کی طرح۔ کھاتی ہوں' پیتی ہوں' سوتی ہوں' جاگتی ہوں۔ مگر اُن سے فرق ہوں کہ میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔ اب مجھے وہ جواری پسند نہیں آیا۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ کیوں پسند نہیں آیا۔ اس کو میں اللہ کی مرضی کہوں گی۔ سنا ہے اللہ دل میں رہتا ہے۔ لہٰذا مجھے پکا یقین ہے کہ یہ اللہ کی مرضی ہے۔ یہ بات جب میں ماں سے کہتی تھی تو وہ چڑ جاتی تھی اور ماتھا پیٹ کے کہتی تھی :

"کفر مت بول لڑکی! کفر مت بول۔ سیدھی جہنم میں جائے گی اور ساتھ مجھے بھی لے جائے گی کمبخت----! میں جانوں میری بیٹی سمجھدار ہے---- مگر۔"

"اسی لیے تو ماں-----!"

وہ مسٹنڈا جس سے ابا نے میرے پیسے پکڑے تھے' رخصتی کے لیے تاریخ' گھڑی پکی کرنے کے لیے میرے باپ پر دباؤ ڈالنے پر اُتر آیا۔ ہر روز اُس کا ذکر گھر میں ہونے لگا اور یوں مجھے معلوم ہُوا کہ اس کا نام مشتاق ہے۔ یہ نام اب ہمارے گھر میں ایسے ہی تھا جیسے گھر ہی کا کوئی فرد۔ وہ میرے دل سے دُور تھا اور ماں بھی شاید کسی فیصلے پر پہنچنے کے

لیے تیار نہ تھی۔

باتیں کرتے ہوئے باپ بڑی رغبت سے کھانا کھا رہا تھا۔ ماں نے مشتاق کے ذکر پر اپنے گریبان کے نیچے ہاتھ ڈالا اور سو سو روپے کے چار سرخ نوٹ نکال کر ابا کے چھابے میں ڈال دیے۔ ابا کا ہاتھ کٹوری میں سے دال سمیٹتا رہ گیا۔

"یہ کیا بھاگوان؟"

"دیکھ سائیں! تم نے مشتاق سے چار سو پکڑے تھے نا! لے' پانچواں سو سُود کا بھی لے لے اور کہہ دے ہمیں یہ رشتہ منظور نہیں۔۔۔۔"

"ہیں۔۔۔۔ منظور کیسے نہیں ماجھاں؟ یہ تُو کیا کہہ رہی ہے بھاگوان! میں نے اُسے زبان دی ہے۔ آخر میں چار لوگوں میں بیٹھتا اُٹھتا ہوں۔ کیا کہیں گے لوگ؟"

میری ماں حسبِ معمول چپ نہ رہی اور بہت تیز سی گئی۔ جانے اس کو اتنا اعتماد کیسے اور کہاں سے آگیا تھا۔ وہ بلا خوف بولے چلی جا رہی تھی۔ ڈر کے مارے میرا کلیجہ منہ کو آ گیا کہ اب مار پٹائی ہوئی کہ ہوئی کیوں کہ انجام یہی ہوتا تھا تُو تُو' میں میں کا اور آج تو معاملہ بھی خاصا گھمبیر تھا تھا۔ اسی لیے ابا چلا کر نہیں دبی دبی اواز میں کہہ رہا تھا :

"تم ماں بیٹی نے آج میرے منہ پر طمانچہ مارا ہے۔ میں دیکھ لوں گا تیری بیٹی کو اور تجھے۔ اصل میں ماجھے! تو ذمہ دار ہے۔"

"رکھی میری اکیلی کی بیٹی نہیں۔ تمہارا ہی بیج ہے۔"

ماں نے ہمیشہ کی طرح جواب دیا۔

میرے دماغ کو بھی جیسے ایڑ لگ گئی' دبکا چپکا نہیں بیٹھا۔ چل سو چل 'تُو' میں' یہاں وہاں کی باتیں دماغ کی پٹاری سے نکلنے لگیں۔ گویا آج ڈھکن اُٹھ گیا تھا۔ پٹاری سے شوکتے پھنکارتے سانپ باہر آنے لگے۔ ان کی زہر بھری شوک پھنکار نے مجھے جیسے گھیر لیا اور میں روتی ہوئی آواز میں چیخنے لگی :

"ابا! یہ تمہارا مشتاق' میں نے دیکھ لیا ہے۔ مجھے ایک آنکھ نہیں بھایا۔ گلوری منہ میں دبائے جگالی کرتا ہوا میری راہ روک کر کہتا ہے۔۔۔۔ 'رکھیے! گل سن۔ تُو میری منگ ہے۔ بھاگتی کیوں ہے مجھ سے۔ میں تجھے اُٹھا کر لے جاؤں تو مجھے کوئی نہیں پوچھے گا کیوں کہ تُو میری منگ ہے' وہ مجھے ایسے دیکھتا ہے جیسے میں اس کی بیوی ہوں۔ میری جوتی بجے

اس کی بیوی۔ " میں پاؤں پٹخ کر بولی۔ ایسے جیسے مجھ پر کوئی جن آگیا ہو اور سچ مچ ماں نے اپنے پاؤں سے جوتی کھینچ کر میری طرف دے ماری۔

"بک بک مت کر رکھیے۔ باپ کے سامنے نہیں بولتے۔ تجھ پر رب کی مار۔ کیا سمجھتی ہے تُو خود کو۔ مت بھول کہ تُو ایک غریب لڑکی ہے۔ عورت ذات۔۔۔۔ کمزور۔۔۔۔ بے بس۔۔۔۔ وہ تو تیرا باپ شریف آدمی ہے' نہیں تو تیرا لہو پی جاتا۔ تُو اس کی غیرت کو مت للکار۔"

میں ماں کے رویے پر حیران پریشان تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تک وہ مجھے اپنی ہمنوا نظر آتی تھی۔ اس طرح اور اتنی جلدی پینترا بدل لے گی مجھے اُمید نہ تھی۔ ماں کو اس طرح یکدم بدلتے دیکھ کر مجھے نہ جانے کیوں رونا آگیا۔ میں اپنے ہی گھٹنوں میں سر دبا کر رونے لگی۔ اس وقت میں کتنی اکیلی تھی۔ بالکل تنہا۔ جیسے چلچلاتی دھوپ میں ایک اکیلی چیونٹی چٹیل میدان میں بھٹکے۔ میرے دماغ کی پٹاری سے نکلے پھنیر سانپ اب پٹاری میں واپس جانے کے لیے تیار نہ تھے۔ سوال ہی سوال میرے دل میں' میرے دماغ میں شُوکتے ہوئے سوال سانپ بن چکے تھے اور میں پوچھنا چاہتی تھی ماں باپ سے' تم دونوں نے مل کر مجھے جنا تو قصوروار میں نہیں۔ ذمہ دار بھی میں کیوں ہونے لگی۔۔۔۔؟ ہاں اب میں ذمہ دار ہوں اپنے لیے۔ خود کے لیے' سوچنے کے لیے۔ میں روتے روتے سوچے چلی گئی۔ ماں تھی کہ بھن بھن بولے چلی گئی۔۔۔۔ ہمیشہ کی طرح۔۔۔۔ باپ کچھ کہنے کی کوشش میں تھا۔

"مجھے تو پہلے ہی شبہ تھا' ماں بیٹی کیا گھالے مالے کر رہی ہیں۔ مجھے شک میں ڈال رہا تھا تمہارا چپ رہنا۔ آج بھید کھل گیا۔ رکھیے! میری ایک بات کا جواب دے' صاف صاف۔ یہ بتا تُو کس کے ساتھ پھنسی ہوئی ہے۔۔۔۔؟"

اس پر ماں جھپٹ کر پھڑپھڑائی' جیسے چوزوں والی مرغی چیل کوّوں پر جھپٹے۔

"ساجے۔۔۔۔! تجھے شرم نہیں آتی بیٹی سے ایسا سوال پوچھتے۔ یہ تو ایسے ہی ہُوا' جیسے۔۔۔۔! کھسم چاہیدا کہ نہیں۔۔۔۔؟ شرم کر ساجے شرم کر۔۔۔۔"

ماں کی طرف سے میرا دل پھر صاف ہو گیا۔ واقعی ماں' ماں ہوتی ہے۔ کیا کرے بے چاری۔ بچہ جننے کی ذمہ داری کے بعد بچے کے دُکھ سُکھ' اس کی زندگی کے لیے بھی وہی

ذمہ داری محسوس کرتی ہے۔ ماں کا پیار' باپ کی طرح وقتی نہیں ہوتا۔ میرا باپ حسبِ عادت اپنے بستر میں لیٹ گیا۔ وہ خلا میں گھور رہا تھا۔ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ اس کے سانسوں کی پھنکار بتا رہی تھی کہ وہ اپنے غصّے کو دبانے کی کوشش میں ہے۔

سوچا جائے تو اپے کا سوال صحیح تھا۔ بے شک میں پھنسی ہوئی تھی کہیں جسے کھول کر میں اپنے آپ کو بھی بیان نہیں کر سکتی تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی صاف ستھرے بابو لوگ مجھے اچھے لگنے لگے۔ سنبھل سنبھل کر سوچنے بولنے والے' احتیاط سے مسکراتے ہوئے نوجوان ایسے جیسے وہ کسی ان دیکھے حصار میں ہوں۔ اس ان دیکھے حصار کو پھلانگنا اُن کے بس کی بات نہ تھی۔ یوں ان کی نگاہوں کی ملائمت کو میں نہ چاہتے ہوئے بھی محسوس کر لیتی تھی۔ مگر میرا اپنا حصار تھا جس کو توڑنے کا میں کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ گھر گھر پھر کر کام کرنے والی لڑکی کے لیے یہ بے بھی ضروری۔ ماں نے مجھے اور میری چھوٹی بہنوں کو کچھ اس طرح سمجھایا تھا۔ وہ یہی کہتی' کسی مرد کا اعتبار نہ کرنا' خواہ وہ تمہارا باپ ہو یا بھائی ہو۔ اُس کی نگاہ کو غلط سمجھنے میں ہی اپنی بھلائی ہے۔ سو میں غلط سمجھنے میں خاصی پکی ہوں۔ مشتاق کس کھیت کی مُولی ہے۔ مجھے تو وہ ڈاکٹر چھوکرا بھی اوچھا لگا جس نے اچانک ایک دن ہسپتال کی راہداری میں مجھے لپٹا کر چوم لیا تھا۔ اُس کے صاف ستھرے لباس کی خوشبو اور لمس آج بھی میرے ساتھ لپٹا ہوا ہے۔

اماں ایسے واقعات کو حادثات کہتی ہے اور محتاط رہنے پر زور دیتی ہے۔ میں نے اس حادثے کے بعد راہداریوں سے گزرنا چھوڑ دیا۔ ان دنوں میں ایک ہسپتال کے ایک وارڈ میں کام کرتی تھی۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا مگر اچانک زاہدہ سٹاف نرس' جو میری ہم عمر لگتی تھی' کے بارے میں کھسر پھسر ہونے لگی۔ ماحول کچھ ایسا ہو گیا جیسے کھچڑی پک رہی ہو۔

"پاؤں بھاری ہو گیا ہے۔۔۔۔ پاؤں بھاری ہو گیا ہے۔۔۔۔"

آہستہ آہستہ سب ہی چرچا کرنے لگے۔ میرا اور زاہدہ کا کبھی کبھی سامنا ہوتا تھا۔ میں نے اُس کے دائیں اور بائیں پاؤں کو کئی بار دیکھا۔ بار بار ہر پھر کر دیکھا۔ مجھے تو ان میں کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ البتہ وہ کچھ صحت مند سی لگنے لگی تھی۔ پہلے سے زیادہ پُرکشش اور خوبصورت بھی۔ وہ اب ہنستی تو لگتا جیسے اُس کی چھاتیاں ھمک رہی ہیں۔ پھر وہ اچانک

غائب ہو گئی۔ کوئی کہتا نوکری چھوڑ گئی۔ کوئی کہتا اُسے نکال دیا گیا۔ وہ قصوروار تھی ---- نہ معلوم کس کی ---- ؟ کچھ ہی عرصہ بعد میں بھی وہ نوکری چھوڑ آئی۔

اب کی بار ماں نے مجھے پھر سے ایک جگہ منسوب کر دیا۔ یہ منگیتر میری ماں کی کسی ملنے والی کا بھائی بھتیجا تھا۔ غلام محمد' میرا ہم عمر۔ تھا تو کسی فیکٹری میں مزدور مگر شکل و صورت سے سنجیدہ اور معقول۔ عام مردوں سے ذرا ہٹ کے۔ میں نے اُسے دیکھتے ہی ہاں کر دی۔ ماں خوش ہو گئی۔ باپ اطمینان سے میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ جلد ہی چند لوگوں کی موجودگی میں مجھے اس کے حوالے کر دیا گیا۔

غلام محمد جسے سب گاما گاما کہتے تھے مجھ پر نثار ہو گیا۔ وہ میرے لیے بڑے بڑے فخر بھرے دعوے کرتا اور ایسے باتیں کرتا جیسے وہ کوئی لیڈر ہو اور سماج میں انقلاب لانا اُس جیسے حوصلہ مند کے لیے مشکل نہیں۔ وہ کہتا' میں غلط وقت میں غلط لوگوں کے گھر میں پیدا ہو گیا۔ رکھیے! میں تجھے وہ مقام دلواؤں گا جس کی تو مستحق ہے۔ لوگ سمجھتے نہیں کہ تو کیا ہے؟ کوئی میرے دل سے پوچھے' کوئی میرے دماغ سے سوچے تو نے اتنا بڑا کام کیا کہ ایک خریدار کے پیسے اُس کے منہ پر دے مارے۔ میں دعوے سے کہتا ہوں ایسی جرأت' آج تک کسی شہزادی' کسی بڑی رئیس زادی نے بھی نہیں دکھائی ہو گی۔ تو نے تو مرد ذات پر تف کر دی۔ واہ بھئی واہ۔ کوئی کچھ کہے' میں سلام کہتا ہوں۔" ہماری بحث چل نکلتی' میں کہتی :

"گامے! تو اپنی سوچ اپنے پاس ہی رکھا کر۔ مجھے گنہگار نہ کر ---- تیرا کیا ہے؟ تو کل کلاں کہہ دے گا کہ رب بھی ڈھکوسلا ہے۔ نہ بھئی نا۔ رب مجھے معاف کرے اور سیدھے سبھا اٹھا لے۔"

گاما ہمیشہ اونچی اونچی باتیں کرتا تھا۔ خواب دیکھنے اور دکھانے کا اُسے ہوکا تھا۔ مثلاً کہتا تھا 'رب نے ہر انسان کو حساب سے زندگی دی ہے' جس کی ایک حد ہوتی ہے ---- وہ حد کب ختم ہو جائے انسان کو کبھی اندازہ نہیں ہوتا۔ بس رکھیے! تیرے رب کا ان ہی باتوں سے پتا چلتا ہے۔ باقی جیتے جی تو انسان کو سب کچھ خود ہی کرنا پڑتا ہے ---- جیسے تم نے کیا ---' میں اُس کو ستانے کے لیے بھولی بن کے چونک جاتی اور پوچھتی :

"کیوں؟ میں نے کیا کیا ہے گامے۔۔۔؟"

"تم نے میری سوچ بدل دی رکھیے! تم نے وہ کیا ہے جو عورت تو کیا عام طور پر کوئی بھی نہیں کرتا۔ میں قدر کرتا ہوں تمہاری۔ شکل کی تو تُو ویسی ہی ہے کالی کلوٹی' بولتی آنکھیں کمبخت۔۔۔۔ لیکن رکھیے۔۔۔۔ تیری ان آنکھوں میں ایک پیغام' اِک آگہی اُمڈتی رہتی ہے جس سے شاید تو خود بھی آگاہ نہیں۔"

ایسے موڈ میں ہوتا تو گاما مسلسل میرا منہ تکتا رہتا۔ خاص طور پر میری آنکھوں میں جھانکتا ہوا اور اپنائیت بھرے لہجے میں بولتا چلا جاتا حتیٰ کہ میرا دھیان ہی موقع سے ہٹ جاتا۔ وہ ایسا کیوں کرتا تھا؟ اب جب وہ نہیں ہے میں اکثر سوچتی اور یاد کرتی ہوں۔ وہ اپنے دعوؤں کو عملی جامہ پہنانے پر ہمیشہ تلا رہتا۔۔۔۔ میں اپنی ماں کی طرح کبھی کبھی چیخ پڑتی۔

"بس بس گامے! اتنی ڈینگیں مت مارا کر۔ مجھے پتا ہے جو تُو ہے اور مجھے اپنے بارے میں بھی پتا ہے۔ کوئی غلط فہمی نہیں ہے مجھے۔ ہم غریب لوگ ہیں' جتنا بھی کرلیں' غریب ہی رہیں گے۔ اللہ نے اولاد کے نام ہمیں ایک بیٹی دی ہے۔ ہم اس کو مل کر پالیں گے' پوسیں گے۔ بے شک بیٹی پرایا دھن۔ یہ ہماری خدمت اور دیکھ بھال نہ کر سکے پر ہماری روحیں اس کو خوش دیکھ کر نہال ہوا کریں گی۔ ہم اُس کا وقت اپنے وقت سے بہتر بنا سکیں۔ یہی اچھا ہو گا۔۔۔۔ بس تُو بھی اپنے وقت میں جینا سیکھ گامے!"

ایسی باتیں کرتے کرتے گاما یک لخت مجھے اپنے گلے لگا لیتا اور بہت جذباتی ہو جاتا۔ میں نڈھال سی ہو کر چپ ہو جاتی۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں تیرتی ہوئی روئیدگی کی تاب لانے کی ہمت مجھ میں نہ تھی۔ بس نظریں جھکا کر زمین ماپنے کی پرانی عادت مجھے ایک سہارا سا دیتی تھی۔ اب بھی دیتی ہے۔ گاما مجھے کہا کرتا تھا تُو ہر وقت اور ہمیشہ اپنے پاؤں تلے بچھی زمین ماپتی رہتی ہے اور میں ایک ہی جواب دیتی تھی۔۔۔۔ اچھا ہے گامے! اس طرح انسان زمین پر ہی رہتے ہوئے بات کرتا ہے' تمہاری طرح نہیں کہ باتوں باتوں میں آسمان تک اُڈاریاں مارتے پھرو اور ایک دن دھڑام سے زمین پر آ گرو۔۔۔۔ گرے یا مرے کو آخر زمین ہی سہتی اور ڈھانپتی ہے' بے چاری ماں جو ہوئی۔۔۔۔ اور گاما ٹھنڈی سانس بھر کے دُور گہرائی سے بولتا:

"او بھاگوانیں۔۔۔۔۔ او بھلیے لوکے۔۔۔۔۔"

ایسا کہتے ہوئے وہ بالکل میرے باپ کی طرح کا لہجہ اختیار کر لیتا تھا اور میں سوچتی تھی سارے مرد ایک جیسے ہوتے ہیں اور ایک جیسی ہوتی ہیں ساری عورتیں بھی۔ جیسی میں، جیسی میری ماں اور شاید ایسی ہی میری ماں کی ماں۔ جب وہ اس طرح 'بھاگوانیں' بھلیے لوکے' کہہ کر ذرا سا رکتا تو میرے کان کھڑے ہو جاتے۔ ایسے ہی ایک موقع پر اُس نے طعنہ دینے کے سے انداز میں کہا تھا:

"تو مجھے جو بھی کہہ رکھیے' تو ایک دن مجھے یاد کرے گی۔ دیکھ لینا۔"

میں نے چونک کر پوچھا:

"کیا کارنامہ کرنے کا ارادہ ہے؟ میں بھی تو سنوں۔"

"فی الحال تو تُو اتنا کر کہ مجھے گاما نہ کہا کر' جی۔ کے' کہا کر۔"

"وہ کیوں۔۔۔۔۔؟" میں اور زیادہ اچنبھے میں تھی۔

"میری پارٹی نے مجھے یہی نام دیا ہے۔ سمجھ لے میرا نیا جنم ہوا ہے۔ میری پارٹی کے بڑوں نے میرا نام غلام محمد کمال رکھا ہے یعنی جی (G) غلام کے لیے اور کے (K) فار کمال۔۔۔۔ جی' کے۔۔۔۔ اب مجھے میرے جاننے والے اور دوست جی۔ کے کہہ کر بلاتے ہیں اور مجھے اس میں گہری رمز اور اونچے معنی نظر آتے ہیں۔۔۔۔ جی کے۔۔۔۔ ہیں نا!"

"مجھے جی۔ کے کا ایک ہی مطلب سمجھ میں آ رہا ہے گامے! جی۔ کے یعنی جی کے جیسے مطلب دنیا میں جی کے دیکھ لیا۔ لمبا جی کے کیا تمغہ ملا۔ جی کے مرنے کا مزا پاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ گامے! اب مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی کہ پارٹی والوں نے تجھ میں کیا کمال دیکھا جو تیرا نام غلام محمد کمال رکھ دیا۔ کمال ہے' کمال ہے نا جی۔ کے۔۔۔۔"

یہ کہتے کہتے مجھ پر ہنسی کا دورہ سا پڑ گیا۔ اگر جی۔ کے مجھے اپنے گرم بوسوں سے ٹھنڈا نہ کرتا تو میں پٹڑی سے اُتر گئی تھی۔ پاگل پن کی لکیر گویا پھلانگ ہی لیتی اُس روز۔ لگتا تھا اِدھر سے اُدھر تک لکیر جیسا مہین سا فرق ہے۔ گامے نے میرے پاگل پن کو وقتی طور پر تھام لیا۔۔۔۔ میں سمجھتی ہوں ہر سوچنے والا بندہ تھوڑا بہت دیوانہ تو ہوتا ہی ہے جیسے میں۔۔۔۔ جیسے میرا جی۔ کے۔

جی۔کے کی مصروفیات اب کچھ بڑھتی جا رہی تھیں۔ اس تبدیلی کو میری بیٹی مشال نے بھی محسوس کیا۔ مشال اب تیسری جماعت میں پڑھتی ہے۔ ماحول کو سمجھنے لگی ہے۔ میں روزانہ اُسے سکول چھوڑنے جاتی ہوں۔ ساتھ میں دو تین دوسری بچیوں کو بھی لاتی لے جاتی ہوں۔ بھروسے کی بات ہے۔ ویسے بچیوں کے ماں باپ مجھے ماہانہ تنخواہ دیتے ہیں' اس طرح میری بچی کے اخراجات بھی نکل آتے ہیں۔ محنت اور شوق کی قدر کرتے ہیں وہ بھلے لوگ۔

ہمارے یہاں کا ماحول کچھ ایسا ہے کہ کوئی بھی محفوظ نہیں۔ بچیاں' عورتیں۔ اکیلی باہر نکلیں تو سمجھو لوٹ کا مال ہو گئیں۔ جو بھی چاہے ہاتھ ڈال لے۔ جی۔کے کو بڑا شوق ہے کہ اس کی بیٹی پڑھ لکھ جائے اور مجھے تو ہے ہی۔ مشکل تو ہے یہ شوق مگر جی۔کے کی پارٹی نے ایک دم اچھے بڑے سکولوں کو سرکاری کر لیا ہے اور ہمیں پکی اُمید ہے کہ ہم غریب محنت کشوں کے بچے بھی پڑھے لکھے جوان بنیں گے کیوں کہ ہمارا وزیراعظم' جو پہلے صدر تھا' ہمارے ساتھ ہے۔ اگرچہ وہ ہم عوام میں سے نہیں۔ جدی پشتی وڈیرا ہے مگر وہ ہماری بات کرتا ہے۔ خواب دیکھتا ہے اور دکھاتا ہے۔ وہ ہمارا ہے۔ ہمارے دلوں میں رہتا ہے۔ جی۔کے تو اپنے اس لیڈر سے عشق کرتا ہے۔ ابھی چند دن پہلے اس لیڈر نے کہا۔۔۔۔ میں ہر پاکستانی بچے کے چہرے پر سُرخی اور ہاتھوں میں کتاب دیکھنا چاہتا ہوں اور میں اپنے عوام سے عشق کرتا ہوں۔ عشق نے جی۔کے کو انتہائی مصروف کر دیا ہے۔ میں جب اُسے گھر اور بچی کی ذمہ داریوں کی طرف دھیان دینے کے لیے کہتی ہوں تو وہ انگریزی میں کہتا ہے:

"بھلے لوگے! Love is a whole time job"

جس کا دھیان عشق سے اِدھر اُدھر ہو جائے وہ سچا نہیں اپنی محبت میں۔ جی۔کے کی وجہ سے انگریزی لفظوں کی مجھے بھی شدبد ہو گئی ہے جیسے "Love is a whole time job" سمجھنے لگی ہوں مگر جی۔کے جتنا نہیں۔۔۔۔۔ اُس کا رویہ۔۔۔۔؟ کبھی کبھی تو مجھے اُس کے بلاخیز ارادوں سے خوف آنے لگتا ہے۔ انقلاب کی آواز نے اس کے جسم کے خون کو پارے میں بدل دیا ہے۔ میں نے سنا ہے سچا عاشق

اپنی جان تک دے سکتا ہے۔ اسی بات کا خطرہ ہوتا ہے اندھے عشق میں۔ اسی بات کا رونا ہے۔ وہ تو شکر ہے مجھے کسی سے عشق نہیں ہوا۔ نہیں تو مارے گئے تھے۔ اپنے باپ 'جی۔کے' کے بارے میں میری مثال پوچھتی ہے :

"اماں! میرا ابا کوئی بڑا آدمی بننے والا ہے۔ گھر نہیں آتا۔ جوش میں آتا ہے' جوش میں چلا جاتا ہے----"

"نہیں بیٹی! جی۔کے اب پارٹی کا کارکن بن گیا ہے۔ قائد عوام نے کہا جو ہے۔ لوگو! تم میرا ساتھ دو۔ ہمیں مل کر تقدیر بدلنی ہے اس ملک کی۔ اس میں بسنے والے عوام کی۔"

اس بات پر میری بیٹی خوشی سے اُچھل کر میرے ساتھ جھول گئی۔ اُسی نے مجھے بتایا کہ قائد عوام کہتے ہیں :

"میں ہر پاکستانی بچے کے چہرے پر سرخی اور ہاتھ میں کتاب دیکھنا چاہتا ہوں۔"

پھر مثال فضا میں مُکا اٹھا اٹھا کر نعرے لگانے لگی :

"قائد عوام----" ساتھ کے گھر سے بچوں کی آواز آئی "زندہ باد" پھر گلی میں کھیلتے بچے نعرے لگانے لگے---- "قائد عوام---- زندہ باد---- انقلاب زندہ باد----"

بچوں کے نعروں میں بڑا دم تھا' جذبہ تھا۔ اُسی وقت باہر سے جی۔کے کی کڑکتی ہوئی آواز مُجتی مُنی ملائم آوازوں کو چیرتے ہوئی کانوں تک پہنچی۔

"بچو! چُپ کر جاؤ۔ مارشل لاء لگ گیا ہے۔" پھر جی۔کے بڑبڑاتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔

"لے بھاگوان! اللہ کے حوالے---- میرے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ کوئی پوچھے تو کہنا ہمیں نہیں پتا----"

جی۔کے نے اتنا کہا اور جن پاؤں آیا اُنہیں پہ لوٹ گیا۔ مجھے اچنبھا نہیں ہوا۔ کیوں کہ اس کا اسی طرح آنا جانا لگا رہتا تھا۔ البتہ مثال بلک کر پیچھے بھاگی :

"ابو----! نہ جاؤ---- نہ جاؤ ابو۔"

وہ آج شدت سے جی۔کے کا انتظار کرتی رہی تھی۔ کوئی خوشخبری تھی جو بیٹی ہم دونوں کو اکٹھے سنانا چاہتی تھی۔ جانے کیا خوش خبری تھی جو مثال نے پھر کبھی مجھے سنائی ہی

نہیں۔ بھول بھال گئی ہو گی۔

وہ دن اور آج کا' میری مثال چپ چپ سی رہنے لگی ہے۔ جی۔ کے واپس نہیں آیا۔ وہ مجھ سے کرید کرید کر پوچھتی ہے "ابو کیوں نہیں آیا" میں اُسے بتانا نہیں چاہتی۔ حالانکہ میں جانتی ہوں' سمجھتی ہوں۔ ایک غریب کارکن کی بیوی جائے تو کہاں اور کس سے پوچھے۔

بہت افراتفری ہے ملک میں۔ کسی کو کسی کا اعتبار نہیں۔ کوئی کسی طرح کی بھی خبر سننے یا کہنے کے لیے تیار نہیں۔ کترا کے نکل جاتے ہیں سبھی۔ سہمے سہمے سے پھرتے ہیں محتاط اور خوفزدہ۔ جیسے بلی کے خوف سے چوہے۔ بلی بھی ایسی جو صرف دانت ہی نہیں' ہاتھوں میں چوہے دان لیے پھرتی ہے۔

دو ہفتے' ہر آہٹ پر کان دھرے سنسناتے گزرے ہیں۔ جی۔ کے کی فیکٹری میں تالہ بندی کی خبر ریڈیو سے سن لی تھی۔ اُس روز مثال نے سوتے دم تک ایک ہی بات مجھ سے نہیں اپنے آپ سے بار بار پوچھی تھی "تو پھر میرا ابو کہاں گیا۔۔۔؟"

اُس کا جواب گونج گونج کر رہ گیا۔ پھر یوں ہوا۔

کچھ لوگ کہتے تھے "ہمارے لیڈر کو بچاؤ" کچھ کئی مہینوں سے قولاً فعلاً اونچی ہاہاکار کے ساتھ برسرِ پیکار تھے۔۔۔ "اسلام بچاؤ" اور میری بیٹی مجھ سے پوچھتی تھی۔

"کیا اسلام بیمار ہو گیا ہے۔۔۔؟ ماں کسی نے اسلام پر وار کر دیا ہے۔ پچھلے کئی مہینوں سے ایسے ہی سننے میں آ رہا ہے۔ "اسلام بچاؤ' اسلام بچاؤ" اُسے دوا کیوں نہیں دیتے لوگ۔ ماں! اسلام ہمیں نظر کیوں نہیں آتا۔ کہاں رہتا ہے۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں "قائد عوام بچاؤ" کیا ان دونوں کی لڑائی ہوئی ہے۔ اسلام اتنا کمزور ہے کہ ایک آدمی سے مار کھا گیا۔۔۔ اسلام اتنا کمزور کیوں ہے ماں!"

مثال اپنے باپ کی طرح بال کی کھال کھینچتی ہے اور باتونی بھی ویسی ہی۔ اب تو وہ بڑی بڑی باتیں کھوجنے لگی ہے۔ جب میں تسلی بخش جواب نہیں دے پاتی تو چپ سادھ لیتی

ہے میری طرح۔

"قائد کو بچاؤ" کمیٹی کے لوگ احتجاجاً اپنے آپ کو آگ لگا کے ناچتے ناچتے مرنے لگے ہیں۔ میں اور میری بیٹی سب لوگوں سے خود سوزی کرنے والوں کا نام معلوم کرتے ہیں۔ کہیں جی۔کے نہ ہو۔ دل ہول جاتا ہے تو ہم ماں بیٹی ایک دوسری سے لپٹ جاتے ہیں۔ گویا ایک دوسری کی پناہ میں چلے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ بیمار اسلام کی کمزوری نے مثال کو پریشان کر دیا ہے۔ غلطی میری ہے۔ میں نے ہی آج تک بیٹی کو ٹھیک سے بتایا نہیں کہ اسلام' انسان ہے یا انسانوں کے لیے ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں خود بھی سمجھ نہیں پائی۔ ایک الجھن ہے کہ ہر وقت موجود رہتی ہے۔ ہاں اسلام کے لیے انسانوں کو مرتے بہت دیکھا' بہت سنا۔ اب تو یہ نام دہشت گردی سے جڑ سا گیا ہے۔ پاکستان اور اسلام لازم و ملزوم ہیں۔

مثال---- میری بچی---- اپنے باپ اور میری طرح چپ رہ کر سوچتی ہے۔ باپ کی موت کا اُسے یقین سا ہو گیا ہے جیسے اسلام مکمل ہو چکا ہو' جو مجھے نہیں ہوا۔ یا میرا اندر کی گواہی پر کان دھرنے کو جی نہیں چاہتا۔ مثال معصوم' ناتجربہ کار جو ہے۔ اُس کے دل کا آئینہ پاک اور صاف ہے ابھی۔ وقت کی گرد نے اُسے دھندلایا نہیں۔ ان کہی باتیں اور ان دیکھے منظر اُسے اپنے آپ آگہی کے طور پر نظر آ جاتے ہیں---- مجھے پتا ہے کہ میری مثال عام بچوں جیسی نہیں۔ وہ ابھی تیسری جماعت میں تو ہے مگر ارد گرد کے حالات کی ٹن گن اُسے دوسرے بچوں سے زیادہ ہے۔ ابھی کل ہی مجھے سکول سے واپسی پر بتا رہی تھی---- "اماں! بچوں کی پارٹی بننے والی ہے۔ میں اُس میں اپنا نام لکھواؤں گی ضرور۔ ٹھیک ہے ناں! ماں----!"

"ابا کے نام والے خانے میں 'جی۔کے' لکھواتا۔ سب حیران ہوں گے اور کہیں گے' ہیں! تُو 'جی۔کے' کی بیٹی ہے۔ تیرے باپ کا بڑا نام ہے مثال!"

"میری مُنّی! میں سمجھی کہ بچوں کی پارٹی والی خبر ہی نئی خوشخبری تھی جو تو باپ کی موجودگی میں سنانا چاہتی تھی۔"

کچھ دنوں سے مثال کو بخار آنے لگا ہے۔ وہ بخار میں بے سُدھ رہتی ہے۔ بڑبڑاتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں اُسے کسی پرائیویٹ ہسپتال کے اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ مگر میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔ بے شک حکومت نے بہت سے پرائیویٹ ادارے سرکاری تحویل میں لے لیے ہیں۔ ان میں کئی ہسپتال بھی ہیں۔ مگر ان ہسپتالوں میں نئے نئے بنے سرکاری لوگوں اور مریضوں کا ہجوم رہنے لگا ہے۔ ہم عام لوگوں کی باری نہیں آتی۔ ایک تو مصیبت یہ ہے کہ ہم عام لوگ ہیں ہی بہت۔۔۔۔ بہت بھیڑ ہے ہماری جو کسی طرح بھی چھٹتی دکھائی نہیں دیتی۔

میری مثال ہروقت غنودگی کی حالت میں رہنے لگی ہے۔ کارخانے کی تالہ بندی کے بعد جی۔کے کی آمدنی ویسے ہی بند ہو گئی اور اُس کے غائب ہونے پر سب کچھ بالکل ہی غائب ہو گیا۔

دو نئے گھروں کا کام مجھے 'جی۔کے' کے غائب ہونے کے بعد جلد ہی مل گیا ہے۔ کام کے سلسلے میں لوگوں میں میری اچھی پہچان ہے۔ وہ جو محاورہ ہے کہ کام پیارا کہ چام۔ حالانکہ میں کالی رنگت' چھوٹی چھوٹی آنکھوں والی' ناٹے قد کی عورت ہوں۔ کوئی دلکشی نہیں مجھ میں۔ میرا کام ہی میری سفارش ہے۔ ویسے میرا تجربہ تو یہ ہے کہ دنیا میں پہلی سفارش صورت اور رنگت ہی ہوتی ہے آدمی کی۔ یہ بہت بڑی پیدائشی دولت ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ باقی برکتیں' نعمتیں وقت کے ساتھ ہاتھ آتی ہیں اور رفتہ رفتہ انسان پر آشکار ہوتی ہیں۔

جن گھروں میں مَیں کام کرتی ہوں' ایک روز' ان میں جو میرا سب سے پرانا گھر ہے' میرا ہمدرد اور ہم خیال بھی ہے' میرے نام سے ٹیلی فون آیا۔۔۔۔ باجی نے فوراً مجھے بلا کر ریسیور میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ دوسرے سرے سے ایک اجنبی مرد کی آواز آئی:

"آپ مسز جی۔کے ہیں۔۔۔۔؟ سلام و علیکم!"

"جی ہاں۔۔۔۔ وعلیکم السلام۔۔۔۔" میں نے جواب دیا۔

"بھابی! آپ کو مبارک ہو۔"

"کس بات کی؟" میں نے چونک کر پوچھا۔ حیرت اور مبارک نے میرے جسم کے ہر رونگٹے کو کان بنا دیا تھا۔ میری آواز لمک بھک سی گئی۔

"بھابی! میرا یار جی۔ کے کام آ گیا۔ وہ آگ کے شعلوں میں لپٹ کر رقص کرتا "جیوے بھٹو جیوے" گاتا چلا گیا۔ لال شعلوں نے ہم سب کو سرخرو کر دیا بھابی۔ آپ پریشان نہ ہونا۔ ہم نے اُس کی لاش وصول کر کے دفن کر دی تھی۔ حالات کا بھابی آپ کو پتا ہی ہے۔ فکر نہ کرو بھابی! بھلے دن ضرور آئیں گے ایک دن۔۔۔۔ اللہ حافظ!"

ٹیلی فون اور ریسیور میرے ہاتھ سے گر گئے۔ میں تھر تھر کانپتی ہوئی گلی میں دوڑتی اپنے گھر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ باجی کی آوازیں میرا پیچھا کرتی دم توڑ گئیں۔ جانے میں یہ خبر کسی دوسرے کو نہیں، اپنی بیٹی مثال ہی کو کیوں سنانا چاہتی تھی۔۔۔۔ مثال۔۔۔۔ میری مُنّی۔ جو نیم جان اور بیمار تھی۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بے وقوفی کی میں نے۔

میں نے جس تیزی سے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا، اُسی تیزی سے میری مُنّی نے سوال کیا:

"اماں! ابو کی خبر آئی ہے۔۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔۔"

"اور ہمارا لیڈر؟"

"قید ہے۔۔۔۔ ابھی زندہ ہے" میں نے تیزی سے تسلی دی۔ اُس نے پھر پوچھا:

"اور اسلام؟ ان دونوں کی لڑائی تھی نا ماں؟"

"ہاں۔۔۔۔ اسلام زندہ ہے اور آزاد بھی۔۔۔۔"

اگرچہ صدمے اور بگ ٹٹ دوڑ نے مجھے نڈھال کر کے مثال پر تقریباً گرا دیا تھا مگر میں بچی کے ہر سوال پر اُسے اپنے سینے پر بھینچتے ہوئے فر فر جواب دیتی چلی گئی۔ میری بچی میں بھی اتنی طاقت نہ معلوم کہاں سے آ گئی تھی، ورنہ وہ تو پچھلے تین ہفتوں سے غنودگی کے عالم میں تھی۔ لیکن اسلام کے بارے میں پوچھنے کے بعد وہ کچھ بولی ہی نہیں۔ میں نے اُسے بستر ہلایا جلایا، پکارا، آوازیں دیں۔ شاید وہ سکتے میں چلی گئی تھی۔۔۔۔ یا۔۔۔۔؟

مجھ میں جانے کہاں سے حوصلہ آگیا۔ آنسو تھے کہ لاکھ کوشش کے باوجود پلکوں تک نہیں آپا رہے تھے۔ آخر میں اسی نتیجے پر پہنچی ہوں کہ کوشش سے دنیا میں ہزار کام بن آتے ہوں گے' سوائے سچے آنسوؤں کے یا سچی محبت کے۔ یہ دونوں کسی اور جگہ سے بن کر آتے ہیں۔ انسان کے بس میں نہیں ہیں۔ کوشش سے باہر ہیں انسان کی۔

پھر یہ بھی تو ہے کہ روئے وہ جس کے آنسو پونچھنے والا کوئی ہو۔ جسے خود رونا اور خود ہی اپنے آنسو پونچھنے ہوں' وہ دو دو کاموں میں نہیں پڑتا۔ سو میں بھی اپنے آپ کو ان دو کاموں کے لیے کبھی آمادہ نہیں کر پاتی---- میں اللہ رکھی ہوں۔ اسی لیے میں زندہ ہوں۔

زندہ رہتی چلی آ رہی ہوں۔ لگتا ہے ہزاروں سال سے جی رہی ہوں۔ ہزاروں نہیں' لاکھوں سال ہو گئے مجھے جیتے ہوئے۔ کروڑوں برس کہہ لیں تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں اللہ رکھی ہوں۔ میں زمین ہوں۔ شاید مجھ پر بسنے والوں کی لتاڑ پچھاڑ مجھے کچھ نہیں کہتی۔ یہ کھیلتے کودتے میرے بچے---- نادان---- نٹ کھٹ' کمزور' نارسا' ناواقف ہونے پر نادم۔

اور میں----

اللہ رکھی ہوں۔

OOOOO

اختتامیہ

افسانے کے میدان میں فرخندہ لودھی ایک مستند اور کہنہ مشق افسانہ نگار کی حیثیت سے معروف ہیں۔ وہ ایک ذو لسانی افسانہ نگار ہیں۔ اب تک اُن کے اُردو میں چار مجموعے "شہر کے لوگ"، "آرسی"، "خوابوں کے کھیت" اور "رومان کی موت" اور پنجابی میں بھی تین مجموعے "چنے دے اولھے"، "ہردے وچ تریڑاں" اور "کیوں؟" اور ایک اُردو ناول "حسرتِ عرضِ تمنا" شائع ہو کر' فکری اور ادبی ذوق رکھنے والے شائقین سے داد وصول کر چکے ہیں۔ ان کے ان ادبی اور افسانوی کارناموں کا ملکی سطح پر اعتراف کرتے ہوئے انھیں 2003ء میں حُسنِ کارکردگی کے صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ان کے افسانے رسمی اور رواتی موضوعات سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ وہ ایک ہوش مند' حقیقت پسند اور باشعور افسانہ نگار ہیں اس لیے ان کے افسانوں کا محور سماجی' معاشرتی' معاشی' عمرانی اور نفسیاتی اُلجھنیں اور مسائل ہیں۔ وہ کہانی لکھتے ہوئے اپنے نکھرے ہوئے فکری ذوق اور شعور کی روشنی میں اِن اُلجھنوں اور مسئلوں کا تجزیہ کرتی ہیں اور اس سے حاصل ہونے والے نتائج کو استدلال اور منطق کے پیرائے میں بیان نہیں کرتیں کیونکہ وہ خلقی طور پر ایک حقیقت نگار' افسانہ نگار کی فطرت اور مزاج کی مالک ہیں اس لیے وہ

زندگی کے الجھیڑوں کے تار و پود سے اپنی کہانیاں بنتی ہیں اور بڑی کامیابی سے اپنی بات کہنے کا گُر جانتی ہیں۔

فرخندہ لودھی کا زیرِ نظر تازہ مجموعہ "جب بجا کٹورا" ان کی بارہ مختصر کہانیوں پر مشتمل ہے۔

فرخندہ لودھی کے افسانے متنوع موضوعات سے سروکار رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں یہ تنوع ان کے گہرے محسوسات' قریبی مشاہدات' ذاتی تجربات اور معاشرتی معلومات کی عطا ہے۔ جب کوئی موضوع ان باتوں کے اتصال سے ان کا تخلیقی تجربہ بنتا ہے تو اس میں سے کئی ابعاد Dimentions پیدا ہوتی ہیں۔ اس مجموعہ میں افسانہ نگار کے مختلف تجربات اور کیفیات کے اتحاد و امتزاج کی کامیاب مثال ان کے افسانے "جب بجا کٹورا" میں دیکھی جا سکتی ہے۔

یہ کہانی ایک پیدائشی کبڑے کے گرد گھومتی ہے۔ جس نے اپنی جسمانی ناہمواری کے نفسیاتی دباؤ کی بنا پر جوانی ہی میں اللہ سے لو لگالی ہے۔ مسجد میں حاضر باش کی بنا پر اُسے "میاں جی" کا نام دیا گیا ہے۔ افسانہ نگار نے بڑی چابکدستی سے میاں جی کی بشریت کو اُجاگر کیا ہے۔ ایک دن شاہی مسجد کو جاتے ہوئے ایک قریبی گلی میں ایک چودہ پندرہ برس کی لڑکی کا "کچا بدن دوپٹے کی سلوٹوں اور سفید وائل کے ڈھیلے کُرتے کے نیچے ہمکتا" دیکھ کر ان کا وضو ٹوٹ گیا۔ وہ وہیں سے واپس اپنے گھر لوٹ گئے۔ اس کے بعد وہ زیادہ خشوع و خضوع سے تقویٰ کی طرف رُجوع کرتے ہیں۔ بقول افسانہ نگار میاں جی کی ماں کو ان کے بیاہ کی فکر آخر دَم تک رہی مگر سماجی حالات نے ساتھ نہ دیا۔۔۔۔۔ میاں جی کی حج کے لیے تیاری کی تفصیلات کا بیان مصنفہ کے مشاہدہ پر دال ہے۔ وہ ایک معمولی ملازمت کرتے ہیں اور اپنی قلیل تنخواہ سے یتیم بچوں کی مدد' ناداروں اور ضرورت مندوں کی داد رسی کرتے رہے۔ افسانہ نگار کے نزدیک انہیں "اس قسم کے کاموں کے بدلے اپنے ہونے کی شہادت ملتی تھی" ۔۔۔۔۔ زندگی کی ساری ہمہ ہمی اپنے ہونے کی شہادت پانے پر ہی تو موقوف ہے۔ علاوہ ازیں میاں جی مسجد میں امامت بھی کراتے ہیں۔

ایک دن کئی سالوں بعد اُن کا ایک پرانا زیرِ کفالت آدمی آیا۔ اب کے اس کی درخواست پھر سے مدد کے لیے نہ تھی بلکہ وہ اپنی بچپن میں بیوہ ہونے والی حج کی آرزومند پھوپھی کے لیے ایک محرم کی قانونی اور شرعی ضرورت پوری کرنے کی غرض سے میاں جی سے نکاح برائے نکاح کی درخواست کرتا ہے۔ میاں جی کو کاغذی نکاح کی پیشکش ایک Tragic Irony تو ہے۔ وہ سائل سے تین دن کی مہلت مانگتے ہیں۔ وہ عرض گزار مقررہ دن آتا ہے تو اسے مسجد میں میاں جی کا جنازہ تیار ملتا ہے۔ ایک افسانے کا یہ انجام فرخندہ لودھی کے دوسرے افسانوں کے برعکس خاصا میلو ڈرامائی ہے۔

فرخندہ لودھی کے بیشتر افسانے کرداری ہیں مگر ہر افسانے کے کردار کی پیشکش کا ڈھنگ اور طریقہ مختلف ہے۔ اس مجموعہ کے ایک افسانے "دادی زہرو" کو متعارف کرانے کے لیے خطاب کا واسطہ اختیار کیا گیا ہے۔

فرخندہ لودھی کو ایسے کرداروں سے خاص دلچسپی ہے جو زندگی کی عام روش سے ہٹے ہوئے ہوں اور روایت شکنی کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ دادی زہرو ایک ایسا ہی کردار ہے۔ دادی زہرو ایک سو برس زندہ رہیں۔ ان کی زندگی کا نمایاں اور یادگار واقعہ سہاگ رات کو سسرال کے گھر سے بھاگ کر واپس میکے آنا ہے۔ اِتنے بڑے اقدام کا سبب یہ بتایا ہے کہ اُس کے حریص خاوند نے پہلی ملاقات میں زیور اُتار لیا تھا۔ یہ اُس کے کردار کی جرأت مندی اور روایت شکنی کو ظاہر کرتا ہے۔ ضمنی طور پر یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اُس نے اپنی پسند کے آدمی سے دوسری شادی کرلی۔ اُس کی خوش نصیبی تھی کہ ڈیڑھ دو سو برس قبل اُس کے بزرگ گوارا کر لیتے ہیں اور رسموں' رواجوں اور روایتوں کی پروا نہیں کرتے۔ دادی زہرو ایک پارسا مذہبی زندگی گزارتی ہیں اور غالباً اُنھوں نے زیست کا یہ انداز اپنے دو سماجی گناہوں کے داغ دھونے کے لیے اختیار کیا ہو گا۔ افسانہ نگار نے یہ بھی بتایا ہے کہ دادی زہرو نے اپنی طویل زندگی کسی سے لڑے جھگڑے بغیر گزار دی حتیٰ کہ وہ اپنی بہوؤں سے بھی کبھی نہ اُلجھیں۔ یہ اس کردار کا ایک مثبت پہلو ہے۔ دادی زہرو بیوگی کے آخری ایام میں حج کی شدید خواہش سے مغلوب ہو کر سفر پر روانہ ہوتی ہیں۔ اس سفر میں ایک

رکاوٹ کا امکان تھا مگر محرم کی جگہ معلم نے اپنا نام لکھ کر یہ مسئلہ تو نہ پیدا ہونے دیا مگر دادی زہرہ نے حرم شریف میں داخلے کے لیے اُس وقت کے قانون کے مطابق فیس ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ اس بات کو قبول نہ کر سکی کہ اللہ کے گھر حاضر ہونے کے لیے فیس دینی پڑے۔ وہ حج کیے بغیر لوٹ آئیں۔ اس افسانے کی آخری سطور میں دادی اماں کی مغفرت کے لیے دُعا کی گئی ہے۔ یہ سطریں زہرہ دادی کے لیے افسانہ نگار کے کلمات تحسین ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مصنفہ' زہرہ دادی کی روش اور رویہ کی تائید کرتی ہیں۔

"جب بجا کٹورا" کی طرح زیر مطالعہ افسانہ بھی حج کی آرزومند بیوہ اور محرم کی ذیل میں آنے والے قریبی رشتوں سے محروم عورتوں کے لیے حج پر جانے کے لیے محرم کا جو مسئلہ پیدا ہوتا ہے' اس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ افسانہ نگار نے اُن عورتوں کے ساتھ گہری ہمدردی کا اظہار کیا ہے جو اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اپنے محدود وسائل کو جز رسی سے استعمال کرتے ہوئے حج پر جانے کی نیت سے رقم جمع کرتی ہیں مگر محرم کا شرعی جواز پورا نہ کر سکنے کی بنا پر اپنی حسرتیں دل میں لیے اس جہان سے گزر جاتی ہیں یا پھر جھوٹا ڈیکلریشن دینے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

فرخندہ لودھی کے افسانوں کا ایک خاص موضوع لڑکیوں کے بچپن اور لڑکپن سے بلوغت کے مرحلہ میں داخل ہونے تک کے نفسیاتی کوائف ہیں۔ ان لڑکیوں کی بڑھتی عمر کے ساتھ ان کے ماں باپ کے' ان کے مستقبل سے متعلق نادیدہ اور نہ معلوم خوف' وسوسے اور اندیشے نمایاں طور پر بیان ہوئے ہیں۔ ان افسانوں میں متوسط طبقہ کی سماجی اخلاقیات کے چند تصورات کا حوالہ بھی آیا ہے۔ ان میں خاص طور پر روایت کی پاسداری کی تلقین کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ "کچھ باتیں جیسی ہیں ویسی مان لینی چاہییں" یہ ایک حقیقت ہے کہ نچلے متوسط طبقہ میں روایت سے بغاوت کی نہ ہمت ہوتی ہے اور نہ طاقت و جرأت۔ ان افسانوں کے واقعات' کردار' ان کا عمل اور رد عمل افسانہ نگار کے قریبی مشاہدہ کا آئینہ دار ہے۔ ان افسانوں میں انسانی فطرت کی بوقلمونی اور افراد کے مزاج کی

رنگا رنگی کے مظاہر اکثر نظر آتے ہیں۔ لہٰذا ان افسانوں کے مطالعہ سے قاری کو انسانی سرشت کا وافر علم اور بصیرت کا کافی سامان فراہم ہوتا ہے۔

اس مجموعہ میں فرخندہ لودھی کے بیشتر افسانے مقسور و مجبور انسانوں کے اقتصادی و معاشی مسائل اور ان مسائل کے اثرات سے پیش آمدہ پریشانیوں کے گرد گھومتے ہیں۔ مثلاً "خاتونِ آخر" کے زیرِ عنوان افسانہ ایک بہاری مہاجر عورت کے حوالے سے اپنے نقطۂ عروج کی طرف بڑھتا ہے جو بال پوائنٹ پین کا گٹھا لیے دفتروں میں فروخت کرنے کے لیے ماری ماری پھرتی ہے۔ افسانہ نگار نے اس عورت کو مرکز بنا کر دو کلرکوں کی زندگی بیان کی ہے۔ اسی طرح "حرامی" کے عنوان سے بھی بہتر روزگار کی جدوجہد میں مصروف ایک نوجوان کی کہانی ہے جو دن رات محنت کے باوجود اپنے مقصد کے حصول میں ناکام رہتا ہے۔ اس کہانی کا انجام بہت اچھا ہے اور قسمت کی ناانصافی پر ایک عمدہ طنز ہے۔ اس کا مرکزی کردار ایک "مِس فِٹ" نوجوان ہے جو اپنی شومئی قسمت کو عیاں دیکھ کر اپنے آپ کو حرامی قرار دیتا ہے۔ "گندی مچھلی" بھی وقت کی ایک ستم رسیدہ عورت کی کہانی ہے۔

"شادم کام" (افسانہ) بہت دلچسپ فن پارہ ہے۔ مگر اس کو تکنیک کی شرائط کے لحاظ سے افسانہ قرار دینا مشکل ہے۔ افسانہ نگار سے اس فنی اختلاف کے باوجود انشائی پہلو سے اس کے بہت سے امتیازی خصائص ہیں۔ بخوف طوالت اس کی تفصیل بیان کرنے سے گریز کیا جا رہا ہے۔

اس مجموعے میں فرخندہ لودھی کے دو افسانے ایسے ہیں جن کے مرکزی کرداروں کا ایک ہی نام ہے حالانکہ وہ آسانی سے ان میں سے ایک افسانے کے مرکزی کردار کو کوئی دوسرا نام دے سکتی تھیں۔ ان دو افسانوں میں نام کی یکسانی کا کوئی سبب افسانہ نگار کے ذہن میں رہا ہو گا۔ ہم قدرے توقف کے بعد یہ بات سمجھ پائے ہیں کہ ان دونوں افسانوں کے بنیادی تجربات افسانہ نگار کے اپنے بچپن کے ذاتی تجربات ہیں یا کسی اس قسم کی بچی کو اُنھوں نے کہیں اپنے اِرد گرد بہت توجہ سے آبزرو کیا ہے۔

اِن دونوں افسانوں میں سے ایک افسانے کا نام "منّی کیسے مرے؟" اور دوسرے افسانے کا نام "چپڑی روٹی" ہے۔ اس کے پہلے ایک تہائی حصہ میں ایک لڑکی "منّی" کی پیدائش سے لے کر بلوغت کی حد میں داخل ہونے تک کی معصوم دلچسپیوں اور قدم قدم پر والدین کی اُسے سیانا ہونے کی فہمائش پر مبنی ہے۔ اس کے آہستہ آہستہ بڑے ہوتے جانے سے وابستہ ماں باپ کی فکرمندی اور پریشانی بیان ہوئی ہے۔ اُس کا باپ ایک چھوٹا کاشتکار ہے جس کا مزارع اُسے چھوڑ چکا ہے کیونکہ اس مزارع کے بیٹوں نے شہر میں مل مزدوری سے اور عرب ریاستوں میں کمائی کر کے حویلی بنالی تھی۔ اس کی بلندی نے اُن کے پشتی مالک کے پردے، سائے اور دھوپ کو اپنے کنٹرول میں لے لیا تھا۔ اس معاشرتی گردباد نے قدیمی کاشتکار کی نوجوان بیٹی کو ہڑپ کر لیا۔ آخر میں انکشاف ہوتا کہ مزارع جیلے تیلی کا چھوٹا بیٹا منّی کو اغوا کر کے کویت لے جاچکا ہے۔

اس کہانی کی بنت میں افسانہ نگار نے بدلتے ہوئے عمرانی حالات، معاشرتی واقعات، روبہ زوال اخلاقی روایات اور اقدار کی شکست و ریخت اور کرداروں کی نفسیاتی کیفیات کے بیان سے ایک فکر انگیز وحدت تاثر پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

فرخندہ لودھی کا یہ افسانہ فنی لحاظ سے بھی ایک مکمل فن پارہ ہے۔ اس افسانے میں کم و بیش سارے فنی تقاضے بروئے کار آئے ہیں اور افسانے کے آغاز و انجام اور درمیان میں کشمکش پیدا کرنے والے دو تین موڑ قاری کی دلچسپی کو آخر تک قائم رکھتے ہیں۔

آخر میں افسانہ نگار کے طرزِ احساس کا ذکر ضروری ہے۔ ان افسانوں میں مصنفہ کے مذہبی رجحان اور روحانیت سے دلچسپی کے شواہد ملتے ہیں۔ ان افسانوں میں حج کا تذکرہ بھی توجہ کا طالب ہے۔

(ڈاکٹر) صدیق جاوید

☆☆☆☆☆
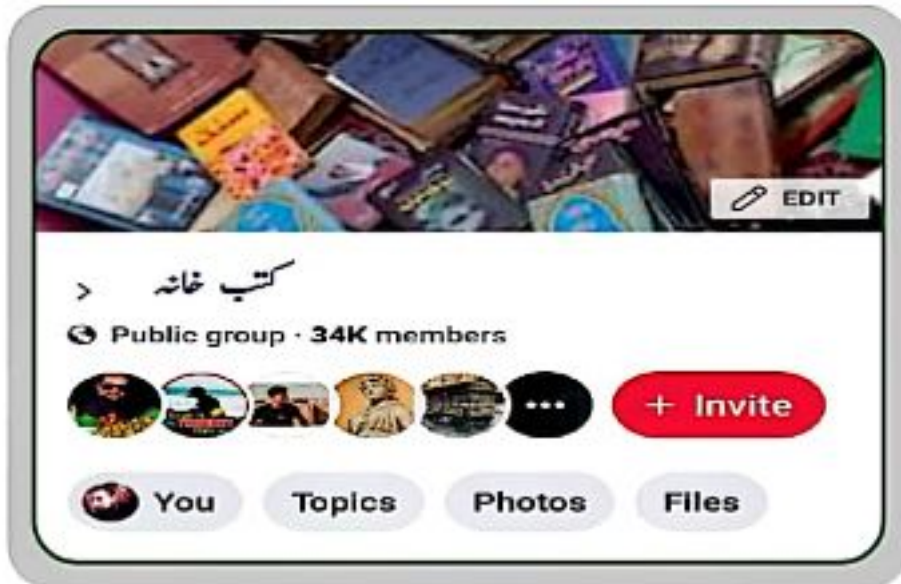
37131 113 685 093
FV Fairview
نام: فرخندہ لودھی
تاریخ پیدائش: 21 مارچ 1937ء
تعلیم: ایم۔اے (لائبریری سائنس)
ایم۔اے (اردو)
اردو کتابیں:
حسرت عرض تمنا (ناول)
شہر کے لوگ (افسانے)
آرسی (افسانے)
خوابوں کے کھیت (افسانے)
رومان کی موت (افسانے)
جب بجا کٹورا (افسانے)
پنجابی کتابیں:
چنے دے اوہلے (افسانے)
ہردے وچ تریڑاں (افسانے)
کیوں؟ (افسانے)
جنڈرا دا انگیار (ناول)
بچوں کی کہانیاں:
بہادر نگر کی شہزادی، پیار کا پنچھی، تانبے کے تین پیسے، ایک بوند شہد، بھوتوں کی دنیا، سات بہنیں،
ویرانے کی صدا (ناول) جیک لنڈن کے ناول (call of the wild) کا ترجمہ
نقل حرفی (فن کتابداری)
اعزازات:
صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی (2004ء)
Lodhī, Farkhundah,
Jab bajā kaṭorā :